تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اردو

حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کا بحران: تجزیاتی مطالعہ

محقق:

حرا مستجاب

243FLL/MSURDU/F20

نگران:

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو (خواتین)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

International Islamic Uni...
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

K
Accession No. TH-27475

MS
891.4393
ح ر ت

حسن منظر۔ تنقید و تجزیہ

اردو افسانہ ۔ تاریخ و تنقید

ادب میں شناخت (فلسفیانہ تصور)

ادب میں ترکِ سکونت

ادب میں جلاوطنی

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ حرا مستجاب رجسٹریشن نمبر 243-FLL/MSURDU/F20 نے ایم۔ ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کا بحران: تجزیاتی مطالعہ"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

Rupees 20 — ۲۰ روپیہ

بیان حلفی

میں مسماۃ حرا مستجاب ولدیت مستجاب احمد رجسٹریشن نمبر 243-FLL/MSUrdu/F-20 شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور ایم-ایس اردو کی سکالر ہونے کی حیثیت سے مقالہ بعنوان حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کا بحران: تجزیاتی مطالعہ نگران استاد ڈاکٹر غلام فرید تحریر کیا ہے۔

میں مسماۃ حرا مستجاب ولدیت مستجاب احمد اس بات کا حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ [illegible] مسماۃ حرا مستجاب نے مطالعہ اور ذاتی کاوش سے تیار کیا ہے اور [illegible] حقائق کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے کوئی امر مخفی نہیں رکھا۔ لہٰذا غلط بیانی کی صورت میں ہر قسم کی ذمہ داری کی مسماۃ ذمہ دار ہوں۔

......المحلف......

حرا مستجاب ولدیت مستجاب احمد

رجسٹریشن نمبر 243- FLL/MS Urdu/F-20

شناختی کارڈ نمبر 61101-1820506-2

شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

1249 / 201 — 29-09-202

61101-1820506-2

واثق مستجاب ولد مستجاب الرحمٰن ساکن ڈیرہ سوسائٹی

بنام مسمی ہ میل گلی نمبر ا مکان نمبر 32 کھنگرال ڈاکخانہ

کھاری کیمو تحصیل و ضلع اسلام آباد بمراد بیان حلفی

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **HIRA MUSTAJAB**

Title of the Thesis: حسن منظر کے ناولوں میں ترکِ سکونت کے مباحث اور شناخت کا بحران: تجزیاتی مطالعہ

Registration No: **243-FLL/MSURD/F20**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Rubina Shahnaz
Professor
Deptt. of Urdu, NUML, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department of Urdu, IIUI
Islamabad

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

اصناف نثر میں ناول کے فن کو بہت اہمیت حاصل ہے کہ حالیہ دور میں بھی یہ صنف پذیرائی کی مراحل طے کر رہی ہے۔ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں قاری کسی بھی عہد کے سیاسی و سماجی، تہذیبی و مذہبی اور معاشی و معاشرتی تاریخ کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ناول چونکہ ایک نثری قصہ ہوتا ہے اور اس میں پیش کئے جانے والے حالات و واقعات کو ادیب اپنے اردگرد کے ماحول اور روزمرہ زندگی سے لے کر بیان کرتا ہے اس لیے ناول کسی بھی معاشرے کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ جب کسی ملک کے حالات و واقعات بدلتے ہیں تو اس ملک کی سیاسی و سماجی اور تہذیبی و ثقافتی نظام میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں ہیں۔ان تبدیلیوں کا اثر ادب اور ادیب دونوں قبول کرتے ہیں اور ادیب ان تبدیلیوں کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے اپنی تحریروں کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

ادب کے ہر صنف کی طرح ناول بھی تحقیق و تنقید کے شعبوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔میرے تحقیقی مقالے کی غرض و غایت حسن منظر کی تخلیقی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کرنا ہے جو انہیں اکیسویں صدی کا ایک کامیاب ناول نگار بناتے ہیں۔ان کی تخلیقی جہات مختلف اصناف نثر پر مشتمل ہیں۔لیکن انہوں نے ناول نگاری کو فنی و فکری دونوں اعتبار سے انفرادیت بخشی ہے۔

میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کا بحران: تجزیاتی مطالعہ " ہے۔یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ترک سکونت کے مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔اس باب میں ترک سکونت کی تعریف، تعارف اور اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ترک سکونت کی صورتیں بھی پیش کی گئیں ہیں۔اور اسی باب میں اردو ناول میں ترک سکونت کی روایت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

باب دوم حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کے بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے مسائل کے متعلق ہے۔اس باب میں تارکین وطن کو بیرون ممالک کن کن ذہنی نفسیاتی مسائل کا سامنا رہا، ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔تیسرے

باب میں تارکین وطن کے تہذیبی و ثقافتی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس باب میں تارکین وطن کو تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے شکست و ریخت کا سامنا اور فرد پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم حسن منظر کے ناولوں میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کا مطالعہ سے متعلق ہے۔ اس باب میں تارکین وطن کو جنسی بے راہ روی، نسلی تعصب اور مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پانچواں باب ماحصل ہے۔ جس میں مقالے کے تمام مباحث کو سمیٹا گیا ہے۔ اس باب میں پورے تحقیقی مقالے کا نچوڑ بیان کیا گیا ہے۔

میں اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ شکر گزار اُس عظیم ہستی کی ہوں۔ جس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ یکتا ہے، تمام تعریفیں اسی ذات وحدہ ولاشریک کے لیے ہیں جس نے مجھے اس کوشش کی ہمت عطا کی کہ میں اپنے تحقیقی مقالے کو پورا کر سکوں۔ بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے بعد میں اپنے والدین کی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے میری زندگی کے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔ خاص کر اپنی ماں کی جنہوں نے اپنے شعور اور الفاظ کی مدد سے میرے تحقیقی کام میں رہنمائی کی اور جہاں جہاں مجھے لگا کہ اب آگے نہیں لکھ سکوں گی تو انہوں نے میری مدد اپنی محبت اور توجہ سے کی۔ اپنے والد محترم کی دعاؤں اور محنت کی وجہ سے ہی آج میں اپنے ایم۔ فل کا تحقیقی مقالہ مکمل کر پائی ہوں۔ میں ابو جی کی بہت زیادہ مشکور ہوں کہ ان کے بے حد اصرار پر ہی میں نے ایم۔ فل میں داخلہ لیا۔ میں اپنے والدین کے ہر اس پل اور لمحے کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو انہوں نے میرے لئے صرف کیے کہ میں تعلیمی سفر میں کامیابی حاصل کر سکوں۔ ان کے لیے میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ

وہ اک پل ہی سہی جس میں تم میسر ہو
اس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں

والدین کے بعد میں اپنی بہنوں خاص کر مریم، کائنات اور تمیمہ کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے حوصلے کے ساتھ ساتھ ہمت بھی دی کہ میں اپنا تحقیقی کام جلد از جلد مکمل کر لوں۔ جہاں میں اپنی بہنوں کی مشکور ہوں وہیں میں اپنی دل عزیز دوستوں کو کیسے فراموش کر سکتی ہوں، جو میرے لیے خدا کا انمول تحفہ ہیں۔ میں اپنی بہترین دوست بریرہ ہمدانی اور عائشہ عنبرین کی بھی شکر گزار اور احسان مند ہوں کہ انہوں نے ہر وقت اپنی مصروفیت کے باوجود میری رہنمائی کی۔ اور ہر ممکن طریقے سے مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔

میں اپنی نگران ڈاکٹر غلام فریدہ کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری مدد اپنی توجہ، محبت اور شفقت سے کی۔ وہ دوران تحقیق در پیش آنے والے مسائل کا حل بھی فراخ دلی سے دیتی رہی ہیں۔ آخر میں میں اتنا کہوں گی کہ آپ بہترین استاد، رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی توجہ، لگن اور مدد کے باعث ہی یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔

حرا مستجاب

ستمبر ۲۰۲۲ء

فہرست موضوعات

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
	پیش لفظ	
	باب اوّل:	ا۔
۱	**ترک سکونت کے نظری وفکری مباحث**	
۲	ترک سکونت کی صورتیں	
۳	مذہبی ترک سکونت	
۸	سیاسی ترک سکونت	
۹	سماجی ترک سکونت	
۱۲	ترک سکونت کے مفاہیم	
۱۵	ترک سکونت کے حوالے سے نظریات	
۲۰	اردو ناول اور ترک سکونت	
۳۳	حوالہ جات	
	باب دوم:	۲۔
۳۶	**حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کا بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے مسائل کا مطالعہ**	
۳۸	حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کی نفی کے مسائل	
۴۵	دیار غیر میں رہتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ	
۵۰	دیار غیر میں رہتے ہوئے اپنے ملک واپس لوٹ جانے کی امید رکھنا	
۵۴	تارکین وطن میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا سبب تنہائی، اداسی، مایوسی، کرب، خوف	
۶۹	حوالہ جات	

۳۔ باب سوم:

حسن منظر کے ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی مسائل کا مطالعہ	۷۲
تہذیب اور ثقافت کی تعریف	۷۳
اردو مصنفین کے تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے نظریات	۷۴
تہذیب کی تشکیل کے عناصر ترکیبی	۷۷
تہذیب و سماجی اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ	۷۸
نسل نو میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات	۹۹
تارکین وطن کا اپنے ملک اور اجنبی ملک کا آپس میں تقابل کرتے رہنا	۱۰۴
حوالہ جات	۱۱۰

۴۔ باب چہارم:

تارکین وطن کو اخلاقی تفاوت کے مسائل کا سامنا	۱۱۳
جنسی بے راہ روی	۱۱۴
مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات	۱۲۵
حوالہ جات	۱۳۵
ماحصل	۱۳۷
کتابیات	۱۴۳

باب اوّل:

ترک سکونت کے نظری و فکری مباحث

باب اول:

ترک سکونت کے نظری و فکری مباحث

اپنی زمین کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین کی طرف نقل مکانی کرنا، ترک سکونت کہلاتا ہے۔ترک سکونت ایک فطری عمل ہے جو قسام ازل سے شروع ہوا جب اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں انسانوں سے عہد لیا تو اس وقت سے یہ عمل وقوع پذیر ہوتا چلا آرہا ہے۔انسانی تاریخ کی سب سے پہلی ترک سکونت حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خطا کی بنا پر جنت سے دنیا کی طرف کرنا پڑی۔یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فطرت کا ارتقا ترک سکونت سے عبارت ہے۔جو عمل انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوا اور آج تک یہ جاری و ساری ہے۔ترک سکونت اختیار کرنے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں جو انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر ایک نئی سرزمین کی طرف نقل مکانی کر جائیں۔

ترک سکونت ایک اصطلاح ہے۔جو دراصل ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو اپنی آبائی زمین سے دور دنیا کے مختلف ممالک میں جا کر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ترک سکونت کے لفظی معنی کو دیکھا جائے تو وہ اپنے رہنے کی جگہ کو چھوڑ دینے کے ہیں۔یوں اپنے وطن یا ملک کو چھوڑنے کی کئی وجوہات یا نوعیتیں ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر لوگ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں۔یعنی اگر کسی علاقے یا ملک کے لوگ سماجی، سیاسی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی مسائل سے دوچار ہوں یا ملک میں خانہ جنگی ہو رہی ہو، لوگ عدم تحفظ کا شکار ہو، معیشت تباہ ہو گئی ہو، جان و مال، عزت و آبرو کو خطرے میں جان کر اپنا علاقہ چھوڑ دینا، تلاش معاش کے لیے، ذاتی مسائل جیسے گھریلو حالات سے تنگ آکر، مذہب کی اشاعت و ترویج کے لیے یا پھر اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی تگ و دو میں اور حصول علم کی خواہش کی تکمیل کے لیے بھی ترک سکونت اختیار کی جاتی ہے۔یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترک سکونت ایک بنیادی عمل ہے جو انسان اپنی زندگی کے لوازمات و خواہشات خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہوں انہیں پورا کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ترک سکونت اختیار کرنے کے حوالے سے منیر شیخ کا کہنا ہے کہ:

> انسانی تہذیب ابھی ابتدائی شکل میں تھی اور معاشرہ بھی کسی بندھے ٹکے نظام پر قائم نہ تھا اس وقت بھی مختلف افراد اور مختلف گروہوں نے بعض ناموافق حالات کے پیش نظر اپنی آبائی زمین کو خیر باد کہا اور اپنی اولاد اور مال اسباب کو لے کر وہاں سے کوچ کر گئے اور زمین کے کسی نئے اور

غیر آباد ٹکڑے پر زندگی کا پھر سے آغاز کیا۔ حیات انسانی کا شیرازہ یونہی بکھرتا اور مجتمع ہوتا رہا ۔ سرزمین وطن کو چھوڑنے کا بڑا سبب جنگ، بیرونی حملے اور اندرونی خلفشار تو تھے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض افراد اور گروہوں نے ایک علاقہ چھوڑ کر دوسرے کو محض اس لیے آباد کیا کہ وہ انسانی فطرت کے اس جذبے کی تشفی چاہتے تھے۔ جس میں خوب سے خوب تر دیکھنے کی خواہش مضمر ہے۔[1]

ترک سکونت اختیار کرنا ایک مشکل کام ہے اور اس کے اسباب چاہے کچھ بھی ہوں ترک وطن کرنے والوں کے لئے ہمیشہ تکلیف دہ عمل ہی رہتا ہے۔ اگرچہ تارکین وطن کو معلوم ہوتا ہے کہ ترک سکونت کے دوران انہیں کن مشکلات و مصائب کا سامنا رہے گا۔ اور کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہونے میں انہیں چند سال لگیں گے ۔لیکن وہ اس امید سے ترک سکونت کرتے ہیں کہ وہاں وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور ان کی آنے والی زندگی پہلے کی زندگی سے نسبتاً بہتر ہوگی۔ یہی امید تارکین وطن کو ترک سکونت اختیار کرنے میں ہمت، حوصلہ اور قوت عطا کرتی ہے۔

ترک سکونت کی صورتیں:

ترک سکونت اختیار کرنے کا عمل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا اور اگر ہم دیکھیں تو تاریخ، مذہب اور ادب میں ترک سکونت کے حوالے سے کئی واقعات اور وجوہات کا ذکر موجود ہے۔ زمانہ قدیم میں جنگوں، قدرتی آفات (سیلاب، قحط سالی، وبا) سے خوف زدہ ہو کر اپنی جان ومال، عزت و آبرو کے لیے لوگ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ترک سکونت اختیار کرنے کے اسباب اور اس کی صورتیں بدلتی گئیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مذہبی ترک سکونت

۲۔ سیاسی ترک سکونت

۳۔ سماجی ترک سکونت

۴۔ بین الاقوامی ترک سکونت

۵۔ قانونی ترک سکونت

۶۔ غیر قانونی ترک سکونت

۷۔ پناہ گزین تارکین وطن کی سکونت

۸۔ بین البرا عظمی ترک سکونت

۹۔ موسمی ترک سکونت

۱۰۔ دیہی اور شہری ترک سکونت

۱۱۔ رضاکارانہ ترک سکونت

۱۲۔ غیر رضاکارانہ ترک سکونت

۱۳۔ قلیل مدتی ترک سکونت

۱۴۔ طویل مدتی ترک سکونت

۱۵۔ اقتصادی ترک سکونت

۱۶۔ اندرون شہر کی ترک سکونت

مذہب اور ترک سکونت:

اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور دین کی تبلیغ کے لئے لوگوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا مذہبی ترک سکونت کہلائے گا۔ یعنی اپنے مذہب، دین کی ترویج کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر بسنا اور لوگوں کو دین حق کا پیغام دینا مذہبی ترک سکونت کے زمرے میں آتا ہے۔ مذہبی ترک سکونت کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جبری اور اختیاری ترک سکونت۔ جبری ترک سکونت سے مراد ہے لوگوں پر ظلم و ستم کر کے اشاعت دین کے رستے میں رکاوٹیں ڈال کر انہیں ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔ جب کہ اختیاری ترک سکونت سے مراد لوگوں کا اپنی مرضی سے کسی دوسرے ممالک میں جاکر دین کی ترویج کرنا، اگر ہم مذہبی نقطہ نظر سے دیکھیں تو کم و بیش ہر نبی اور

پیغمبر کو ترک سکونت اختیار کرنا پڑی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر ہجرت لفظ کو ترک وطن کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔"[۳]

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لیے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"[۳]

ایک اور جگہ پر قرآن مجید میں سورۃ النساء میں ارشاد ہوا ہے:

"وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔"[۴]

"اور جو اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے نکلا اللہ و رسول کی طرف ترک وطن کرتے ہوئے پھر اسے موت نے آلیا تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ پر ہو گیا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"[۵]

یعنی کوئی اپنے دین کے تحفظ کے لئے، اپنے وطن، اپنے معاش اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائے اور جہاں وہ اپنے مذہب، اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کر سکے اور وہاں اسے کسی پابندی یا تکالیف و مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پہلی ترک سکونت حضرت آدم و حوا کو اپنے مسکن یعنی جنت سے اپنی خطا کی بنا پر دنیا کی طرف کرنا پڑی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کو ان الفاظ میں جنت سے زمین کی طرف جانے کا حکم دیا:

"وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ۔"[۶]

"ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔"[۷]

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو تبلیغ حق کی دعوت دی۔ مگر سوائے چند لوگوں کے کسی نے حضرت نوح علیہ السلام پر یقین نہیں کیا بلکہ انہیں تکلیفیں پہنچائیں تو حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ترک وطن کا کہا کہ ایک بڑا طوفان آنے والا ہے تم ایک کشتی تیار کرو اور اپنے پیروکاروں کو ساتھ لے جاؤ۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں سید قاسم محمود نے حضرت نوح علیہ السلام کے ترک وطن کو اسلامی حوالے سے پہلی ہجرت قرار دیا ہے۔ "اسلامی تاریخ میں پہلی ہجرت کا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام سے منسوب ہے۔ جب انہوں نے طوفان کے وقت اللہ کے حکم سے دجلہ و فرات کی سرزمین سے کوہ وجودی کے لیے ہجرت اختیار کی۔"[۵] کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے زمین کی طرف ترک سکونت کی تھی اور زمین پر موجود نبیوں اور پیغمبروں میں سے پہلی بار اپنی زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں جا کر بسنا، حضرت نوح علیہ السلام نے شروع کیا۔ یوں یہ اسلامی تاریخ میں زمین سے کسی دوسری زمین کی طرف پہلی ترک سکونت کہلائی۔ اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کا تعلق "عاد" قبیلے سے تھا۔ یہ قوم یعنی عاد "بت پرست تھے۔ توحید کا کوئی تصور اس قوم میں موجود نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی رہنمائی کے لیے حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا کہ وہ اس قوم کو راہ راست پر لائیں لیکن حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے ان کی تعلیمات اور تبلیغ کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو ارض عاد سے ترک وطن کا کہا۔ تاکہ قوم عاد پر عذاب نازل کیا جائے۔

حضرت صالح علیہ السلام کو بھی اللہ نے دین کی تبلیغ کے لیے "قوم ثمود" کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا۔ یہ قوم بھی بت پرستی کا شکار تھے۔ وہ حضرت صالح علیہ السلام کی دینی تعلیمات پر ایمان نہ لائے بلکہ حضرت صالح کے لیے مشکلات اور مصائب میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی کردار کشی کی۔ قوم ثمود نے حضرت صالح اور ان کی تعلیمات پر ایمان لانے سے انکار کیا تو اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ملک القریٰ سے شام کی طرف نقل مکانی کی۔ کئی عرصے سے وہاں (شام) دین حق کی تبلیغ کرتے رہے پھر مکہ تشریف لے آئے اور اپنی باقی کی زندگی مکہ میں ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف و مشغول رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی دین حق اور اسلام کی ترویج کے لیے کئی ممالک میں ترک سکونت اختیار کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباؤ اجداد کا تعلق عراق سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آپ کو بابل لے آئے۔ آپ علیہ السلام نے یہاں سے دین حق اور اسلام کی ترویج کا سلسلہ شروع کیا۔ اُس وقت نمرود کی حکومت تھی۔ لوگ بت پرست تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں سے کہا

کہ بتوں کی پرستش چھوڑ دو، ایک اللہ پہ ایمان لاؤ۔ وہ تمہاری سنے گا۔ یہ بت نہ تو سن سکتے ہیں نہ ہی دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارے کسی کام آسکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بت خانے کے بتوں کو توڑا تو نمرود نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ روشن کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سزا کے طور پر آگ میں جھونک دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام صحیح سلامت رہے۔ اس واقعے سے بہت سے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ پہ ایمان لے آئے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔"[9]

"میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں (یعنی ترک وطن کرتا ہوں) وہی میری رہنمائی کرے گا۔"[10]

یوں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور ان کی تعلیمات پر ایمان لائے،، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو لے کر اردن اور پھر مصر کی طرف سکونت اختیار کر گئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام مختلف ممالک میں راہ ہدایت اور ایمان کے لیے ترک سکونت اختیار کرتے رہے۔ حضرت لوط علیہ السلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے انہوں نے بھی دین حق کے لیے ترک سکونت اختیار کی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی پہلی ترک سکونت بابل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی کی گئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی ترک سکونت اسلامی تاریخ میں ایک اہم حوالہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد محترم کی بے حد پسندیدہ اور محبوب اولاد تھے۔ آپ کے والد ہمیشہ آپ علیہ السلام کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے۔ یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کو ناگوار گزرتی تھی اس لیے ایک دن بہانے سے سوتیلے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کو باہر لے گئے اور آپ علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا۔ وہاں سے ایک قافلہ مصر کے لئے گزر رہا تھا، ایک شخص کنویں سے پانی پینے آیا تو اس نے آپ کو دیکھا اور اپنے ساتھ مصر لے گیا ۔اس واقعے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی ترک سکونت کا آغاز ہوا۔ اور وہ مصر آ گئے یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی دینی تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ ترک سکونت اختیار کی۔ اگرچہ یہ ایک سیاسی اور مذہبی ترک سکونت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں فرعونوں کی حکومت تھی اور ان کے فرمان کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ فرعون کا یہ حکم تھا کہ جہاں بھی لڑکا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے اور بیٹیوں کو زندہ رکھا جائے۔ بنی اسرائیل کی قوم فرعون کے اس ظلم وستم سے بہت تنگ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ اِنَّ ھٰۤؤُلَآءِ لَشِرۡذِمَۃٌ قَلِیۡلُوۡنَ۔"[11]

"ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑے، بے شک تمہارا پیچھا کیا جائے تو فرعون نے شہروں میں جمع (فوجیں) کرنے والوں کو بھیجا اور کہا (بے شک) وہ لوگ تھوڑی ایسی جماعت ہے۔"[12] اور جب اس ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی تو حکم الٰہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے تو فرعونی لشکر نے آپ کا پیچھا کیا اور انہیں دریا کے کنارے جا پایا۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی تب یہاں رب العالمین نے انہیں نجات دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا یعنی لاٹھی کو اللہ کے حکم سے دریا میں مارا تو اس کی برکت سے دریا میں خشک رستہ بن گیا اور پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ قوم موسیٰ اس میں سے بخیریت گزر گئے اور جب فرعونی لشکر دریا میں اترے تو عین وسط میں اللہ تعالیٰ نے دریا کو دوبارہ آپس میں ملا دیا اس طرح تمام فرعونی لشکر اس میں غرق ہو گیا۔ یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سمیت مصر سے نکلنا، اسلامی تاریخ میں مذہبی ترک سکونت کے حوالے سے اہم واقعہ ہے۔

مذہبی ترک سکونت کے حوالے سے اسلامی تاریخ میں اہم ترین حوالہ حضرت محمد ﷺ اور صحابہ اکرام کی مکہ سے حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ترک سکونت ہے۔ قریش مکہ حضرت محمد ﷺ کے شدید مخالف تھے اور اسلام، دین مذہب کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ جن لوگوں اور صحابہ اکرام نے اسلام قبول کیا تو انہیں قریش مکہ کی شدید مخالفت اور مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں جب قریش مکہ کا ظلم حد سے بڑھ گیا اور آپ ﷺ نے دیکھا کہ قریش مکہ میں ایمان والوں کی جان و مال محفوظ نہیں تو اللہ کے حکم سے حضرت محمد ﷺ نے صحابہ اکرام کو ترک وطن کا کہا۔ اس طرح صحابہ اکرام نے رات کے اندھیرے میں مکہ سے ترک وطن کرتے ہوئے حبشہ کی طرف سکونت اختیار کی۔ اس واقعے کے بارے میں صفی الرحمن مبارک پوری اپنی کتاب الرحیق المختوم میں لکھتے ہیں کہ:

> ادھر رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ اصحمہ نجاشی شاہ حبش ایک عادل بادشاہ ہے۔ وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حبشہ ہجرت کر جائیں۔۔ اس کے بعد ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ۵ نبوی میں صحابہ کرام کے پہلے گروہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اس گروہ میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ حضرت عثمان بن عفانؓ ان کے امیر تھے۔ اور ان کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے اللہ کے راہ میں ہجرت کی۔[۱۳]

اسی طرح حضرت محمد ﷺ نے بھی تیرہ سال مکہ میں انتھک کوشش کی کہ وہاں کے لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں اور آپ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی تسلیم کریں۔ لیکن مشرکین مکہ کے ظلم وستم میں شدت آجانے کی وجہ سے نبی ﷺ نے مدینہ کی طرف سکونت اختیار کرتے ہوئے اپنی جائے پیدائش یعنی مکہ معظمہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ تاریخ اسلام میں ہجرت مدینہ کو اس لیے بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے کہ ترک وطن سے قبل صحابہ اکرام اور اہل ایمان والے بے کسی اور مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن ترک وطن نے انہیں ایک نئی زندگی بخشی اور وہ مدینہ میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، نیز ہجرت مدینہ نے اسلام کی ترقی اور ترویج کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔

مذہبی ترک وطن کے حوالے سے اسلامی تاریخ میں یہ اہم واقعات ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرام، محدثین، فقہا، اولیا اکرام، صوفیا اکرم اور مختلف مذہبی شخصیات نے مذہب اور دین حق کی تبلیغ کے لیے ترک سکونت اختیار کی۔ جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

سیاست اور ترک سکونت:

سیاسی ترک سکونت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب کسی علاقے یا ملک میں خانہ جنگی ہو، ملکی حالات خراب ہوں، معیشت تباہ ہو چکی ہو، مختلف سیاسی جماعتوں اور نظریوں کے باہم تصادم سے عام شہری پریشان ہوں، جلسے جلوس اور مہنگائی کی وجہ سے انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو چکا ہو اور عام شہری کا اپنے ہی ملک میں رہنا دشوار ہو جائے تو پھر انسان اپنی بقا کے لیے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں ترک سکونت اختیار کرتا ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ صدی سے ۲۰ صدی تک کئی ممالک نے اپنے ملکوں کی آسانی، ترقی اور خوشحالی کے لیے، عسکری طاقت کے زور پر دوسرے ملکوں پر قبضے کئے۔

> یورپی نو آبادیاتی نظام نے خاص طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے لوگوں کو اپنے ہی وطن میں بے گھر، جلاوطن اور اجنبی بنادیا۔ الجزائر کے جو یورپ کی آبادی (colony) تھا، ادب میں جلاوطنی کی ایسی نوعیت ملتی ہے۔ جس میں لوگ خود اپنے وطن میں رہتے ہوئے جلاوطن ہو گئے ہیں اور یورپی جارحیت کو برداشت کر رہے ہیں۔[۱۴]

۱۴۹۲ء سے اٹھارویں صدی کے درمیاں سپین اور پرتگال، انگلینڈ، فرانس اور نیدرلینڈ نے نو آبادیات قائم کیں۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کا برصغیر میں قیام ہی انگریزوں کا برصغیر پر قبضہ ثابت ہوا۔ اگرچہ یہ نقل مکانیاں سیاسی اور شعوری طور پر کی گئیں۔ لیکن ان نقل مکانیوں نے مقبوضہ ممالک کی تہذیب و ثقافت اور روایات و اقدار پر گہرے اثرات مرتب کیے اور آج کے دور میں سیاسی حوالے سے ترک سکونت کی بہترین مثال افغانستان میں ہونے والے سیاسی حالات ہیں۔ جہاں افغانی عوام، طالبان کے خوف سے، جان و مال کی حفاظت کے لئے اور ملکی معیشت کے تباہ ہونے سے اپنے ملک کو چھوڑ کر پڑوسی ممالک خاص کر پاکستان اور ایران جیسے ملکوں میں تارکین وطن کی حیثیت سے جا بسنے پر مجبور ہیں۔

سماج اور ترک سکونت:

سماجی ترک سکونت سے مراد پنے سماج یعنی معاشرے کو مختلف وجوہات کی بنا پر رہائش چھوڑ کر کسی دوسرے ملک یا علاقے میں جا کر بسنا ہے ۔انسان اپنے ارد گرد کے ماحول سے یا زیرِ رہائشی علاقہ کے رہن سہن ،عادات و اطوار سے تنگ اور پریشان ہو تو وہ کسی دوسرے ملک یا علاقے کی طرف نقل مکانی کرتا ہے، اس کے علاوہ اپنی زندگی کے لوازمات و خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنے معاشرے کو اپنی مرضی سے خیر آباد کہہ دینا بھی سماجی ترک سکونت کے زمرے میں آئے گا۔ سماجی ترک سکونت کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے لوگ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں۔ سماجی ترک سکونت کی ایک اہم وجہ تعلیم ہے ۔مثال کے طور پر انسان اپنی اعلی و معیاری تعلیم کے حصول کے لئے دیہات سے شہر اور پھر شہر سے بیرون ملک سکونت اختیار کرتے ہیں۔ان ترک سکونت اختیار کرنے والوں میں سے بعض لوگ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے علاقوں میں لوٹ جاتے ہیں اور بعض انہی میزبان ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔اسی طرح حصول روزگار کے لیے بھی لوگ اپنے معاشرے کو چھوڑ کر بہتر روزگار، تلاش معاش اور پیشہ ورانہ مواقع کے لیے گاؤں سے شہر اور شہر سے بیرون ملک ترک سکونت اختیار کرتے ہیں ۔خاص کر سائنس اور ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد، ڈاکٹر اور انجنیئر وغیرہ اپنا ملک اس لیے بھی چھوڑتے دیتے ہیں کہ انہیں بیرون ممالک میں زیادہ تنخواہ اور زندگی کی وہ ساری ضروریات، آرام و آرائش اور سہولیات میسر ہوتی ہوں گی جو اُن کو اپنے ملک میں میسر نہیں ہوتیں۔

اس کے علاوہ نسلی اور مذہبی تعصبات بھی سماجی ترک سکونت کا سبب بنتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک ہی سماج میں رہتے ہوئے فرقہ بندی یا رنگ و نسل کے امتیاز کی وجہ سے دو گروہ ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ آج کل

امریکہ میں نسلی امتیاز ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے جہاں انگریز لوگ سیاہ فام لوگوں کو رنگ کی وجہ سے ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں، تاکہ سماج میں ان کا رہنا مشکل ہو جائے اور وہ ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے علاوہ غیر موزوں حالات، ابتری سہولیات، مال و اسباب کا فقدان، ماحولیاتی آلودگی، جاگیرداری کے مسائل، شادی کے کم امکانات، روزگار کے ناکافی مواقعے اور جان کو لاحق خطرات بھی سماجی ترک سکونت کا سبب بنتے ہیں۔

بین الاقوامی ترک سکونت:

لوگوں کا اپنے ملک سے باہر بیرون ممالک میں سکونت اختیار کرنا ہو بین الاقوامی ترک سکونت کہلاتا ہے۔ بین الاقوامی ترک سکونت معاشی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

قانونی تارکین وطن:

وہ تارکین وطن جو وصول کنندہ قوم کی اجازت سے کسی دوسرے ملک میں سکونت اختیار کرتے ہیں قانونی تارکین وطن کہلاتے ہیں۔

غیر قانونی تارکین وطن:

اس قسم میں وہ تارکین وطن شمار کیے جائیں گے جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسرے ملکوں میں نقل مکانی کر جاتے ہیں۔

پناہ گزین تارکین وطن:

پناہ گزین تارکین وطن وہ ہوں گے جو ظلم و ستم سے بچنے کے لیے بین الاقوامی سرحد عبور کر جائیں۔

بین البراعظمی ترک سکونت:

بین البراعظمی ترک سکونت سے مراد ایسے لوگوں کی نقل مکانی ہوتی ہے جو ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں لوگوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم نقل مکانی کرنا مشکل ہوتا تھا۔ جبکہ حالیہ زمانے میں مواصلات کا نظام اور اس کی فراہمی نے لوگوں کا سفر محفوظ اور پر آسائش بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ ایک براعظم سے دوسرے براعظم آسانی سے ترک سکونت اختیار کرتے رہتے ہیں۔

موسمی ترک سکونت:

بعض اوقات موسمی تبدیلیاں بھی لوگوں کو ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر قدرتی آفات (سیلاب بر فباری، زلزلہ، قحط سالی) کے وقوع پذیر ہونے سے لوگوں کے گھر متاثر ہوتے ہیں اور وہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے کسی دوسرے شہر نقل مکانی کرتے ہیں۔ اس لیے موسمی تبدیلیوں کے نتیجے میں لوگ قلیل مدت کے لیے ترک سکونت اختیار کرتے ہیں اور حالات بہتر ہونے کی صورت میں واپس اپنے آبائی وطن لوٹ جاتے ہیں۔

دیہی اور شہری ترک سکونت:

دیہات سے ترک سکونت اختیار کرنے کی بڑی وجہ دیہاتوں میں تعلیم، صحت کے نظام اور سہولیات کا فقدان ہوتا ہے۔ دوسری ترک سکونت دیہات سے شہر کی طرف ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں میں فرسودہ رسومات، جاگیردارنہ نظام سے تنگ اور بنیادی وسائل کی کمی بھی لوگوں کو دیہات سے شہر کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

رضاکارانہ ترک سکونت:

رضاکارانہ ترک سکونت سے مراد لوگوں کا جان بوجھ کر اپنی آبائی زمین کو چھوڑ کر دوسرے ممالک میں سکونت اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ایسے تارکین وطن بہتر گھر، محفوظ مستقبل اور روزگار کے بہتر مواقع کے لیے اپنی مرضی سے ترک سکونت اختیار کرتے ہیں۔

غیر رضاکارانہ ترک سکونت:

غیر رضاکارانہ ترک سکونت سے مراد ایسے لوگوں کی ترک سکونت ہے جن کو ان کی مرضی اور رضا کے بغیر نقل مکانی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس ذیل کی ترک سکونت میں حکومت اور اتھارٹی لوگوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ لوگوں کے دوسری جگہ منتقلی کی وجہ اُن جگھوں پر کوئی حکومتی پراجیکٹ، مختلف ڈیم کی تعمیر اور معدنیات کی تلاش ہوتی ہیں۔

قلیل مدتی ترک سکونت:

قلیل مدتی ترک سکونت سے مراد ایسے تارکین وطن ہیں جو مختصر عرصے کے لیے اپنے عزیز و اقارب، وطن اور زمین سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ اپنے گھر کی تعمیر، نئے کاروبار کے لیے درکار دولت کمانے کے لیے ترک سکونت اختیار کرتے ہیں اور اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ آتے ہیں۔ قلیل مدتی ترک سکونت اختیار کرنے والے ہر حال میں واپس اپنے آبائی وطن جانے کی امید رکھتے ہیں اور وہ خود کو میزبان ممالک میں جذب نہیں ہونے دیتے۔

طویل مدتی ترک سکونت:

طویل مدتی ترک سکونت وہ ترک سکونت ہوتی ہے جہاں لوگ زیادہ عرصے کے لیے سکونت اختیار کرتے ہیں اور پھر اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں، لیکن اپنے آبائی وطن نہ لوٹنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اس لیے بھی اپنے آبائی وطن نہیں جانا چاہتے کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اقتصادی اور سماجی وسائل کا فقدان ہو گا۔

اقتصادی ترک سکونت:

اقتصادی ترک سکونت وہ ترک سکونت ہو گی جس میں لوگ معاشی مواقع کی تلاش کے لیے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دوسرے ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اقتصادی وسائل کے لیے کی جانے والی ترک سکونت قلیل اور طویل مدتی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اندرون شہر کی ترک سکونت:

ایک ملک کے اندر ہی مختلف علاقوں اور خطوں کی طرف نقل مکانی کرتے رہنے کو اندرون شہر کی ترک سکونت کہا جائے گا۔

ترک سکونت کے مفاہیم:

ترک سکونت ایک ایسا عمل ہے جس میں افراد، خاندان یا کوئی انسانی گروہ اپنے آبائی ملک، اصل زمین جہاں ان کے آباؤ اجداد، روایات و اقدار اور اپنی شناخت موجود ہو، اس ملک یا زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا کر

اپنی زندگی بسر کرتے ہیں تو۔ترک سکونت کے لغوی معنی ہیں ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر بسنا۔جب کہ ترک سکونت کے اصطلاحی معنی سے مراد ہے "وطن کو چھوڑ دینا"۔اردو کی مختلف لغات میں ترک سکونت کے معنی ومفاہیم کچھ یوں بیان ہوئے ہیں مثلاً فیروز اللغات میں لکھا ہے" ترک:(ع۔ا۔مذ)چھوڑنا، دست برداری۔سکونت:(س۔کو۔نت)،بودوباش،مستقل قیام،مسکن،مکان۔"[۱۵]

فرہنگ آصفیہ میں یوں درج ہے :" ترک :(ع۔اسم مذکر) چھوڑنا ، تیاگ ، درگزر ۔سکونت:(ع۔اسم مونث)بودوباش،قیام،اقامت،ریاست بساست،رہنے کی جگہ،مسکن۔"[۱۶]

نسیم اللغات میں لکھاہے:"ترک:چھوڑدینا،درگزر۔سکونت:رہ پڑنا،قیام،بسنا۔"[۱۷]

نور اللغات میں لکھاہے:"ترک:(ع،چھوڑنا۔چھوڑاہوا)مذکر،فروگزاشت۔سکونت:بودوباش،رہ پڑنا،اختیار کرنا ۔"[۱۸]

اردو لغت تاریخی اصول میں درج ہے:" ترک: دست برداری ، کنارہ کشی ، تیاگ ، بھول چوک، سہو۔سکونت :اقامت،پڑاؤ،قیام"۔[۱۹]

اردولغات کے علاوہ انگریزی زبان میں ترک سکونت کے لیےDisplacementکالفظ استعمال ہوتا ہے ۔جس کا مطلب ہے: تارکین وطن،ترک وطن، نقل وطن، تبدیل مقام، نقل مکانی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا وغیرہ۔مذکورہ بالا لفظی معنوں کے علاوہ ڈسپلیسمنٹ کے اصطلاحی معنی ہیں وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں نقل مکانی ، مقامی جگہ سے دوسری جگہ منتقلی اور لوگوں کا اپنے آبائی وطن سے دور رہنا۔انگریزی لغات میں ڈسپلیسمنٹ کے جو معنی ومفاہیم لکھے گئے ہیں کچھ یوں ہیں۔

Merriam webster dictionaryکے مطابق:

The act or process of displacing : the state of being displaced a storm that caused the displacement of thousands of people.[۲۰]

اس اصطلاح کو ان ہزاروں لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے گھر سے بے گھر ہوئے ہوں۔

Cambridge dictionaryکے مطابق:

The situation in which people are forced to leave the place where they normally live.[21]

وہ صورت حال جس میں لوگ اُس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور ہیں جہاں وہ عام طور پر رہتے ہیں۔

Voculabory.com dictionary کے مطابق:

The act of changing the location of something.[22]

اپنی جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ نقل مکانی کرنے کا عمل۔

Oxford learners dictionary کے مطابق:

The act of forcing somebody/something away from their home or position ,the largest displacement of civilian population since World War Two.[23]

کسی کو زبردستی اس کے اپنے گھر یا مقام سے دور کرنا کہ وہ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوں، لوگوں کی سب سے زیادہ نقل مکانی دوسری جنگ عظیم کے بعد شہری آبادیوں میں کی گئی۔

Lexico.com نے تعریف یوں کی ہے:

The enforced departure of people from their homes, typically because of war, persecution, or natural disaster.[24]

زیادہ تر جنگ، ظلم و ستم اور قدرتی آفات کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں سے جبری طور پر نقل مکانی کرتے ہیں۔

Yours dictionary کے مطابق:

The act of displacing.[25]

بے گھر ہونے کا عمل۔

Word reference dictionary کے مطابق:

The act of displacing or the condition of being displaced.[26]

نقل مکانی کرنے کا عمل، یا ان کے لیے جو اپنے ملک سے دور آباد ہوئے۔

Collins dictionary کے مطابق:

Displacement is the forcing of people away from the area or country where they live.[۲۷]

وہ لوگ جو اپنے اصل وطن یا علاقے سے دور جا بسے جہاں وہ پہلے سے رہتے تھے۔

Ldoce.com dictionary کے مطابق:

Formal when a group of people or animals are forced to leave the place where they usually live.[۲۸]

انسانوں اور جانوروں کا وہ گروہ جسے ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے جہاں وہ پہلے سے آباد تھے۔

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں دیکھیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بھی انسان کا اپنے آبائی وطن، زمین، عزیز و اقارب کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جانا ترک سکونت کہلاتا ہے۔

ترک سکونت کے حوالے سے نظریات:

ڈسپلیسمنٹ (ترک سکونت) کے حوالے سے ادب میں مختلف نظریہ سازوں نے اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ ان نظریہ سازوں میں ایک اہم نام اکرم الدیک (Akram al Deek) کا ہے، جن کا تعلق فلسطین سے ہے۔ انہوں نے اپنے زندگی کے بیس سال انگلینڈ میں کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے میں صرف کئے۔ اکرم الدیک آج کل امریکن یونیورسٹی آف مدابا میں اسسٹنٹ پروفیسر کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک مصنف، مابعد نو آبادیات مطالعات، عالمی ادب، ثقافتی اور ادبی تھیوری کے لیکچرار ہیں۔

ترک سکونت کے حوالے سے اکرم الدیک کی کتاب (Writing displacement) شائع ہوئی ہے۔ اکرم الدیک کی یہ کتاب دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد تارکین وطن کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ تارکین وطن جب کسی دوسرے ملک میں نئے سرے سے آباد ہوئے تو انہیں کن کن مشکلات اور مصائب کا سامنا رہا، نیز فلسطینی جلاوطنی، ترک وطن کی وجہ سے شناخت کے مسائل اور ان کی تبدیلی کا مطالعہ، ان جیسے موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اکرم الدیک نے اپنی اس کتاب میں ہندوستانی، یہودی، چینی اور افریقی تارکین وطن کی ترک سکونت کو بنیادی موضوع سمجھتے ہوئے ان کو در پیش مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔

اکرم الدیک کا اپنی کتاب(Writing Displacement) میں کہنا ہے کہ تارکین وطن کو میزبان ممالک میں ثقافتی، معاشرتی، نفسیاتی اور سب سے اہم لسانی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی تارکین وطن جب بیرون ممالک میں جا کر آباد ہوتے ہیں تو انہیں اپنی زمین، روایات اور اقدار یاد آتے رہتے ہیں۔ جو لوگ کسی بھی وجہ سے دوسرے ممالک میں نقل مکانی کرتے ہیں تو وہ اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے وطن کے لیے پرانی یادوں اور نئی سرزمین سے خوف کا احساس محسوس کرتے ہیں، جو بے گھر ہونے کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بیرون ملک میں بیگانگی، تنہائی، مایوسی، اپنی جڑوں سے دوری، شناخت کا مسئلہ اور ناسٹلجیا جیسے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

ولیم سفران(William Safran) کا تعلق جرمنی سے ہے۔ ولیم سفران ۱۹۳۰ کو جرمنی کے شہر رومانیہ میں پولش تارکین وطن کے والدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ جرمنی میں نازی حکومت(ایڈولف ہٹلر) کے ظلم وستم کی وجہ سے ولیم سفران نے اپنی جوانی کے تین سال سے زیادہ کا عرصہ ایک یہودی بستی اور جبری مشقت کے کیمپ میں بسر کیا۔ ۱۹۴۶ میں اپنے خاندان کے زندہ بچ جانے والے افراد کے ساتھ امریکہ ترک سکونت کر گئے۔ اس کے بعد ولیم سفران نے نیویارک کے سٹی کالج سے تاریخ میں بی اے اور بین الاقوامی امور میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، دو سال تک امریکی فوج میں خدمات انجام دیں، اور اوٹو کرچیمر کی نگرانی میں کولمبیا یونیورسٹی سے پبلک لاء اور گورنمنٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۵ میں کولوراڈو بولڈر یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوئے اور اسی ادارے میں ۲۰۰۳ تک اپنی پروفیسر شپ سے ریٹائر ہوئے۔

ولیم سفر کی عالمی شہرت کی وجہ نسلی سیاست، قوم پرستی، اور اس سے متعلقہ مضامین جیسے ادارہ جاتی اور ثقافتی تکثیریت، شہریت، بین الاقوامی نقل مکانی، ترک سکونت، ڈائیاسپورا اور شناخت کے مسائل ہیں۔ ترک سکونت کے حوالے سے ولیم سفران نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ تارکین وطن کے ترک سکونت اختیار کرنے کے پیچھے کچھ محرکات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں، وہ محرکات سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، لسانی، معاشی اور ذاتی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔

ولیم سفران نے ترک سکونت کے حوالے سے جو نظریات پیش کئے ہیں وہ یہ کہ تارکین وطن اپنے اصل وطن (مرکز) سے دور ہیں جہاں سے ان کا تعلق تھا۔ ولیم سفران کے مطابق جو لوگ اپنے آبائی وطن سے دور رہ رہے ہیں، لیکن وہ اپنے آبائی وطن کے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں اور اسے اپنی یادوں کا حصہ بنائے رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے تارکین وطن میزبان ملک میں خود کو مکمل طور پر ضم نہیں کر سکتے۔ تارکین وطن چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی وطن ایک نہ ایک دن واپس جائیں گے۔ ترک وطن کرنے والے بیرون ملک میں رہتے ہوئے بھی اپنے آبائی وطن کو ذہن

میں رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بیرون ملک میں رہتے ہوئے اپنے آبائی وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کوشاں رہے ۔یوں وہ اپنے آبائی وطن کے ساتھ محبت کا رشتہ میزبان ملک میں رہتے ہوئے بھی برقرار رکھے ہوتے ہیں۔

رابن کوہن(Robin Cohen)ایک مصنف،دانشور اور سماجی سائنسدان ہیں۔وہ جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے عبادان،نائجیریا(۱۹۶۹۔۱۹۶۷)،برمنگھم،یوکے(۱۹۷۷۔۱۹۶۹)اور ویسٹ انڈیز کی یونیورسٹیوں میں بطور پروفیسر کے اپنی خدمات سرانجام دیں۔(۲۰۰۳۔۲۰۰۱)تک یونیورسٹی آف کیپ ٹاؤن میں ڈین آف ہیومینٹیز مقرر رہے۔رابن کوہن(Robin Cohen)بیسویں صدی کے ان اہم نقادوں اور مفکرین میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہجرت،سماجیات،سیاست،بین الاقوامی نقل مکانی،نسل،ترک سکونت،بین الاقوامیت اور عالمگیریت جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔رابن کوہن کی عالمی شہرت کی وجہ گلوبلائزیشن،ہجرت اور ڈائیاسپورا ک ادب کے شعبوں میں نئے نت تجربے کرنا ہے۔وہ ڈویلپمنٹ اسٹڈیز کے ایمریٹس پروفیسر اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے انٹرنیشنل مائیگریشن انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔ان کی تصانیف کے نام اور سنہ اشاعت درج ذیل ہیں:

Labour and politics in Nigeria.	1981ء
Endgame in South Africa?The Changing Structures & Ideology of Apartheid	1986ء
The new helots: migrants in the international division of labour	1988ء
Democracy And Socialism In Africa	1991ء
Contested domains:debates in international labour studies	1991ء
Frontiers of identity : the British and the others	1994ء
The Cambridge Survey of World Migration.	1995ء
Theories of Migration	1996ء
Diasporas and the nation-state:from victims to challengers	1996ء
Migration, Diasporas and Transnationalism.	1999ء
Introduction: conceiving cosmopolitanism	2002ء

Global Social Movement's	ء2004
Migration and its enemies: global capital, migrant labour and the nation state	ء2006
Global Diasporas: An Introduction	ء2008
Global Sociology	ء2012
Encountering Difference	ء2016
Refugia: Radical Solutions to Mass Displacement	ء2019
Migration:The Movement of Humankind from Prehistory to the Present	ء2021

رابن کوہن کی تمام تصانیف میں ترک سکونت کے حوالے سے اہم کتاب Global Diasporas ہے ۔انہوں نے اس کتاب میں ترک وطن کی چار اہم اقسام بیان کی ہیں جن کی وجہ سے زمانہ قدیم میں ترک سکونت اختیار کی جاتی رہی ہے۔ پہلی قسم لیبر ترک سکونت یعنی مزدوروں اور غلاموں کی اپنے وطن سے دوسرے ملک ترک سکونت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسری قسم امپیریل ترک سکونت میں ان لوگوں کی ترک سکونت کو موضوع بحث بنایا ہے جو دوسرے ممالک پر اپنے ممالک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے قبضہ کرتے ہیں۔اس کی مثالیں رابن کوہن نے نو آبادیاتی نظام سے ظاہر کی ہیں۔ تیسری قسم کی ترک سکونت میں وہ لوگ شمار کئے گئے جو تجارت کے فروغ(ترقی) کے لئے ترک وطن کر جاتے ہیں۔ جبکہ آخر میں ثقافتی ترک سکونت کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہ قسم ثقافتی تبدیلیوں کو نمایاں کرتی ہے کہ تارکین وطن کی ثقافت سب اہم مسئلہ ہے جو کسی بھی تارکین وطن کو درپیش ہے کیونکہ وہ نئی ثقافت میں ضم نہیں ہو سکتے۔اپنی کتاب میں رابن کوہن نے ترک سکونت کے حوالے سے جو نظریات بیان کئے ہیں وہ یہ کہ تارکین وطن ان لوگوں کو کہا جانا چاہیے جو اپنے اصل وطن سے دور(مختلف ممالک میں پھیلنا) ہوتے ہیں۔ان کے اپنے وطن سے دور ہونے کی وجوہات کچھ بھی ہو سکتی ہیں ،مثلاً تشدد اور دباؤ کی وجہ سے لوگوں کا ترک سکونت اختیار کر جانا یا پھر کام، تجارت کے لیے بھی ترک سکونت اختیار کی جاتی ہے۔خواہ ترک سکونت کی صورتیں کچھ بھی ہوں، تارکین وطن میزبان ممالک میں رہتے

ہوئے اپنے آبائی وطن کو اپنی یاد داشت کا حصہ بنائے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تارکین وطن چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی وطن کی ماضی کی عظمت اور کامیابیوں کو مثالی بنائیں اور اس کے احیاء کے لیے کام کرتے رہے۔

موجودہ تحقیقی مقالے میں رابن کوہن کی کتاب سے اخذ کردہ درج ذیل فریم ورک کا اطلاق کیا جائے گا اور اس کے لیے معلومات کی فراہمی کا ذریعہ حسن منظر کے تمام ناول ہوں گے۔ فریم ورک کے نکات درج ذیل ہیں۔

☆ اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑ کر اجنبی شہر یا ملک میں منتقل ہونا۔

☆ یاد ماضی، وطن کی یاد، اپنی زمین سے دوری کا احساس اور ماضی پرستی سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ۔

☆ ترک سکونت اختیار کرنے والوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا سبب تنہائی، اداسی، مایوسی، کرب، خوف اور ذہنی وجسمانی کوفت جیسی کیفیات۔

☆ تارکین وطن کا دیار غیر میں رہتے ہوئے اپنے ہم ملکی لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور اپنی ملکی ترقی وخوشحالی کے بہتر ہونے پر واپس جانے کی امید رکھنا۔

☆ اپنی تہذیب وسماجی اقدار کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والی جھنجلاہٹ۔

☆ دیار غیر میں رہتے ہوئے اپنی تہذیب وثقافت اور روایات واقدار کو تحفظ دینے کی کوشش کرنا۔

☆ تارکین وطن کا اپنے ملک اور اجنبی ملک کا آپس میں تقابل کرتے رہنا۔

☆ نسل نو میں مشرقی ومغربی اقدار کے حوالے سے ردوقبول کی کیفیت سے دوچار ہونا۔

☆ میزبان ممالک تارکین وطن میں نسلی امتیازی سلوک اور جنسی بے راہ روی کے مسائل۔

☆ میزبان ممالک میں رہتے ہوئے تارکین وطن کو اپنے مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات کا سامنا۔

ان نکات کی روشنی میں حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کے بحران کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ تارکین وطن کس طرح کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور لسانی مسائل سے دوچار ہیں؟ اور ان مسائل کی نوعیت کیا ہے؟ ان تمام مباحث کی روشنی میں حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت اور شناخت کے بحران کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اردو ناول اور ترک سکونت:

ناول اس قصے یا کہانی کو کہتے ہیں جس میں مافوق فطرت عناصر کے بجائے زندگی کے مسائل، معاملات اور حالات وواقعات کو بیان کی جائے۔ اردو میں ناول براہ راست انگریزی سے ہی آیا ہے اور اب یہ لفظ ناول اردو ادب میں ایک اہم صنف سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔ناول ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب، زندگی اور معاشرے کا تعلق آپس میں گہرا ہوتا ہے۔ایک ادیب چونکہ معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور وہ خود کو معاشرے سے الگ نہیں کر سکتا اس لیے وہ معاشرے میں موجود سیاسی، مذہبی، تہذیبی، لسانی مسائل اور حالات وواقعات کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ نیز ان حالات وواقعات سے وہ خود بھی متاثر ہوتا ہے اور پھر انہیں ادب کا حصہ بناتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں موجود ہر عہد میں وقوع پذیر ہونے والے مسائل اور حالات وواقعات ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے ناول کسی بھی معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: " زندگی کو اس طرح ادب کے سانچے میں ڈھالنا کہ اس کی ساری وسعتیں اور گہرائیاں اس سانچے میں سما سکیں۔ادب کی کسی اور صنف کے ذریعے سے ممکن نہیں سوائے ناول کے "۔[۲۹]

یوں تو اردو ادب میں ناول لکھنے کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے ہی ہوا جب برصغیر میں انگریز تجارت کی غرض سے آئے اور یہاں کے مالک بن کر بیٹھ گئے۔انگریزوں نے نہ صرف برصغیر کے سیاسی و سماجی وسائل پر قبضہ کیا بلکہ ان کے مذہب اور تہذیب وثقافت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔برصغیر کے باسیوں کو اس حد تک ذہنی و جسمانی غلام بنایا کہ وہ اپنی تہذیب وثقافت، روایات اور اقدار سے دور ہوتے چلے گئے۔اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ادبی شخصیات نے عوام میں دوبارہ سے زندگی کی جستجو، ترقی، شعور اور اپنے تہذیبی ورثے کی بحالی کے لئے تحریریں لکھنا شروع کیں اور انہی تحریروں کی وجہ سے اردو ادب میں مختلف رجحانات اور تحریکات وجود میں آئیں۔

ناول کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیں تو اردو کا پہلا ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کو سمجھا جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول اصلاحی ناول ہیں، جو عورتوں کی اصلاح اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر، سرشار اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم نام ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں کا موضوع اسلامی تاریخ کو ہی بنایا ہے۔علامہ راشد

الخیری کے ناول بھی زیادہ تر اصلاحی اور عورتوں کی تربیت کے حوالے سے لکھے گئے۔ ان ناول نگاروں کے ناولوں کو اردو ناول کا ابتدائی دور تصور کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کو اردو ناول کا جدید دور قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور میں ادیبوں نے اپنی تحریروں میں ان موضوعات کو زیر بحث بنایا ہے جو انسانی زندگی کے مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کے ادیبوں میں مرزا ہادی رسوا، پریم چند، عصمت چغتائی، کرشن چندر، قاضی عبد الغفار، سجاد ظہیر، راجندر سنگھ بیدی، رئیس احمد جعفری، عزیز احمد اور احسن فاروقی کے نام نمایاں ہیں۔ ان ادیبوں نے اپنی تحریروں میں حقیقت نگاری، زندگی کے تلخ تجربات، عام انسان کے بنیادی اور گھریلو مسائل کو بیان کیا ہے۔ بعد ازاں ملک کی تقسیم یعنی ۱۹۴۷ کے واقعات نے جہاں انسانی دکھوں، آزمائشوں، تکلیفوں اور ترک وطن کے دوران نہ ختم ہونے والے مسائل کو اجاگر کیا۔ وہیں ادیبوں نے بھی ان مشکلات اور مصائب کو جھیلا بلکہ اسے برداشت کیا اور اپنی تحریروں میں بھی اسی درد اور کرب کو سمیٹا جو انہوں نے ترک وطن کے دوران برداشت کیے۔ ۱۹۴۷ء کے باعث کی جانے والی نقل مکانی اور اس دوران پیش آنے والے حالات و واقعات کو جن ادیبوں نے اپنی تحریروں میں لکھا۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ کے نام نمایاں ہیں۔

تقسیم ہند کی وجہ سے بے شمار لوگوں اور ادیبوں نے ہندوستان (برصغیر) کو خیر باد کہا اور ایک نئی جگہ جا کر آباد ہوئے۔ اگرچہ یہ جبری ترک سکونت تھی جو اس وقت کے لوگوں کو کرنا پڑی۔ ایک نئے ماحول میں خود کو نئے سرے سے آباد کرنا، تارکین وطن کے لیے مشکل ترین امر ثابت ہوا۔ اس جبری ترک سکونت نے لوگوں اور ادیبوں میں اپنی تہذیب و ثقافت، روایات اور اقدار کے کھونے کا احساس، آباؤ اجداد، اپنی زمین سے دوری، اپنے عزیز و اقارب اور ماضی کو دوبارہ سے حاصل کرنے کی خواہش جیسے موضوعات کو پروان چڑھایا۔ اس ترک سکونت کے دوران جہاں لوگوں پر جسمانی طور پر مختلف اثرات مرتب ہوئے۔ وہیں انہیں بہت سے ذہنی اور روحانی مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس ہی تناظر میں عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں لکھا گیا، جو پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان تک کے حالات و واقعات پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں عبد اللہ حسین نے پاکستان کے بننے اور اس کے نتیجے میں کی جانے والی ترک سکونت کو موضوع بنایا ہے۔ عبداللہ حسین کا یہ ناول استحصال، غربت، نقل مکانی، سیاسی واقعات اور انسان کی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے اور کہانی اپنا تمام تر سفر نعیم کے کردار کے ساتھ ہی طے کرتی ہے۔ ناول میں دوسری جنگ عظیم کے حالات و واقعات، اس کے ہندوستان پر اثرات،

برصغیر میں آزادی کی جستجو، تقسیم ہند کے فسادات اور قیام پاکستان کے حالات و واقعات کو مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ناول میں روشن پور ایسی جگہ دکھائی گئی ہے جو دو تہذیبوں کا مرکز ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں اور دونوں اپنی اپنی تہذیب و ثقافت رکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی جنگ کے لیے انگریز اسی گاؤں سے لوگوں کو زبردستی جنگ کے لیے یورپ بھیجتے ہیں، جب کہ وہ لوگ ترک وطن کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ جنگ کے لئے ترک وطن کرنے والوں میں نعیم بھی شامل ہوتا ہے جو پہلے یورپ پھر افریقہ کی طرف نقل مکانی کرتا ہے۔ ناول میں اس جبری ترک سکونت کا اظہار نعیم اور مہندر کے ذریعے یوں ملتا ہے۔ "پر ہم یہاں کیوں ہیں۔" ہم "کس لئے آئے ؟کیونکہ جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس۔ ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔ انگریز روشن آغا کے مالک ہیں"[۴۰]

خدیجہ مستور اردو ادب کے اہم مصنفین میں شمار کی جاتی ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل خدیجہ مستور لکھنؤ میں رہائش پذیر تھیں۔ تقسیم ہند کے باعث وہ پاکستان آکر آباد ہوئیں، اس لیے بھی ان کی تخلیقات میں ترک سکونت، نقل مکانی اور ہجرت کے دوران پیش آنے والے مسائل جیسے عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ترک سکونت کے حوالے سے خدیجہ مستور کا ناول آنگن "اہم ناول ہے۔ مصنفہ کا یہ ناول آنگن دو حصوں یعنی ماضی اور حال پر مشتمل ہے۔ ناول نگار نے ناول کے پہلے حصے میں ماضی جب کہ دوسرے حصے میں حال کو بیان کیا ہے۔ آنگن ناول کا مرکزی کردار عالیہ ہے اور ناول کی کہانی اسی کردار کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ تقسیم ہند کے باعث عالیہ اپنی والدہ کے ساتھ ترک سکونت کرتے ہوئے پاکستان آجاتی ہے۔ وہ بظاہر لاہور میں ایک مکمل زندگی بسر کر رہی ہے۔ روزی روٹی کے لیے عالیہ سکول میں ملازمت کرتی ہے، جس سے وہ گھر کا خرچہ اٹھاتی ہے، لیکن عالیہ کا کردار پاکستان میں رہتے ہوئے بھی یاد ماضی میں گم دکھائی دیتی ہے۔ وہ ذہنی کشمکش، اضطراب اور بے چینی کا شکار ہے۔ اس کے ذہن میں پرانی یادوں اور جگہوں کا بسیرا ہے۔ وہ بڑے چچا اور چچی کو خطوط لکھتی ہے اور ان خطوط کے جواب کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ عالیہ بظاہر لاہور میں رہ رہی ہے لیکن اس کی زندگی اپنی گم شدہ زمین، عزیز و اقارب کے بارے میں سوچتے ہوئے گزر رہی ہے، جس کا اظہار ناول میں یوں کیا گیا ہے:

> اسے اس وقت وہ بچی یاد آرہی تھی، جس کی کتابیں امرت سر میں رہ گئی تھیں۔ اور وہ ان کتابوں کو یاد کر کے اب بھی روتی ہے۔ اس نے بدلے میں اس کو کئی کتابیں دیں، مگر وہ ان کتابوں کو نہیں بھولتی۔[۴۱]

خدیجہ مستور کا دوسرا ناول زمین بھی ترک وطن کے دوران پیش آنے والے مسائل، قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ابتری نیز مہاجروں کے مسائل پر لکھا گیا ناول ہے۔ خدیجہ مستور کے اس ناول کا مرکزی کردار ساجدہ ہے، جو اپنے والد کے ساتھ اتر پر دیش سے ترک سکونت کرتے ہوئے پاکستان کے شہر لاہور میں آتی ہے اور ایک مہاجر کیمپ میں پناہ گزیں ہوتی ہے۔ ناول میں ساجدہ ترک وطن کرتے ہوئے جس ذہنی اذیت، انتشار اور افراتفری کی کیفیت سے نہ صرف خود گزرتی ہے بلکہ ان تمام حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی بھی ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں تارکین وطن کی بے بسی، ترک وطن کرتے ہوئے عورتوں کی بے حرمتی، غلط طریقے سے کوٹھیوں کی الاٹمنٹ، فریب، جعل سازی، بے ایمانی، ہوس اور دولت واستحصال جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اس کی مثال ناول میں کاظم کے والد کے ذریعے سے کی گئی ہے جو اپنی جائیداد مناسب قیمت پر فروخت کر کے پاکستان آتا ہے اور پاکستان میں اسے چار کنال کی کوٹھی مع سازو سامان کے مل جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اسے یہ شکوہ رہا کہ: "مہاجروں کے لیے تو ہزاروں غم ہیں، گھر بار لوٹ گئے، لاکھوں کے مالک خاک ہو گئے، اب تم دیکھ لو نا ہمیں یہاں آکر کیا ملا"۔ [۳۲]

ساجدہ اپنے والد کے ساتھ جب پاکستان آتی ہے تو وہ اور اس کے والد خود کو پاکستان کے نئے ماحول اور نئی زمین سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ قیام پاکستان سے قبل ساجدہ کے والد رمضان دہلی میں کپڑوں کی دکان کے منشی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے وہ اس دکان کو یاد کرتے ہوئے ناظم کو یوں بتاتے ہیں: "ارے ناظم صاحب! نہ پوچھیے کہ کیا کیا چھوڑ آیا ہوں۔ پانچ کمروں کا مکان، ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان، وہاں دو منشی کام کرتے تھے، کیا دن تھے وہ بھی۔۔۔۔۔" [۳۳] مختصر یہ کہ خدیجہ مستور کے دونا ولوں آنگن، زمین، ترک سکونت اختیار کرنے والوں کی زندگی، ترک وطن کے دوران پیش آنے والے مسائل اور حالات وواقعات کے بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔

ہر ادیب کی کوئی نہ کوئی تخلیق ایسی ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے آنے والے دور میں اس کا مقام و مرتبہ متعین ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا بھی ان کی ایسی ہی ایک تخلیق ہے جو ہر دور میں اپنی ادبی حیثیت سے معتبر رہے گا۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا، تقسیم ہند کے المیے، نقل مکانی، ترک وطن، قدیم ہندستانی تہذیب و ثقافت، روایات اور اقدار کے موضوع پر لکھا گیا اہم ناول ہے۔ مصنفہ کا یہ ناول ۱۹۵۹ میں شائع ہوا۔ اس ناول کی کہانی تقریباً تین ہزار سال پہلے کی ہندوستانی تہذیب، روایات اور اقدار سے شروع ہوتی ہے اور تقسیم ہند کے واقعات کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے اس ناول کو دیکھا

جائے تو مصنفہ نے ناول کو چار ادوار میں تقسیم کر کے لکھا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ قدیم ہندوستانی تہذیب سے شروع ہو کر مسلم دور حکومت کے آغاز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ دوسرا حصہ مسلم حکومت کا دور عروج، تیسرا حصہ اودھ اور مغل بادشاہوں کا دور زوال جب کہ ناول کا آخری حصہ تقسیم ہند یعنی قیام پاکستان کے پس منظر اور پیش منظر کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول آگ کا دریا میں ترک سکونت کے حوالے سے گوتم نیلمبر کا کردار نمایاں ہے ۔ گوتم نیلمبر ویدوں کے عہد کا طالب علم ہے جو حصول علم کے لیے ترک وطن کرتا ہے اور جنگلوں میں جابستا ہے۔ گوتم نیلمبر کا یہی کردار انگریزوں کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہے اور جب ۱۹۴۷ میں ملک تقسیم ہوتا ہے تو گوتم سفارتخانے کے کارکن کی حیثیت سے کئی ممالک مثلاً انگلینڈ، ماسکو اور نیویارک میں ترک سکونت اختیار کرتا رہتا ہے۔

انتظار حسین اردو ادب کا اہم نام اور معتبر حوالہ سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے تقسیم ہند کے بعد سے اردو فکشن لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کے تقریباً تمام ناول اور افسانے ترک سکونت، نقل مکانی، یاد ماضی، شناخت کے مسائل اور اس دوران پیش آنے والے حالات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین کی تمام تخلیقات میں ترک سکونت کا کرب، مایوسی، اپنی بستیوں، گلی محلوں سے بچھڑنے، روایات و اقدار اور آباؤ اجداد کی یادوں کا پیچھے چھوٹ جانے کا غم بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین کے ناولوں کی بات کی جائے تو ان کے ناولوں میں بستی، آگے سمندر ہے اور تذکرہ اسی موضوع پہ لکھے گئے ناول ہیں۔

انتظار حسین کا ناول بستی ترک سکونت کے حوالے سے لکھا گیا ناول ہے۔ بستی ناول میں روپ نگر وہ بستی دکھائی گئی ہے جس کے لوگ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار ذاکر ہے، جو تقسیم ہند کے باعث ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے پاکستان کے شہر لاہور میں آکر آباد ہوا۔ ذاکر مشرقی یوپی کے علاقے روپ نگر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ذاکر کی یادیں اپنے آبائی وطن سے جڑی ہوئی ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ یاد ماضی اور یاد وطن میں گم دکھائی دیتا ہے۔ اقتباس:

> مجھے اپنے گم شدہ پیڑ یاد آرہے تھے، گم شدہ پیڑ، گم شدہ پرندے، گم شدہ صورتیں، نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا، صابرہ، لمبے جھونٹے، نیم کی نبولی پکی، ساون کب کب آوے گا۔[۲۳]

بستی ناول میں بار ہا جگہوں پر ذاکر میں یہ خواہش ابھرتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ واپس اپنے آبائی وطن (روپ نگر) کی حویلی جائے۔ ناول نگار نے ناول میں ذاکر کے کردار کے ذریعے ترک وطن کرنے والوں کی ذہنی اور جسمانی بے چینی کی بخوبی عکاسی کی ہے کہ وہ کس طرح ذہنی کشمکش اور ماضی میں کھوئے ہوئے، شکستہ دل نظر آتے ہیں۔

انتظار حسین کے ناول تذکرہ کا مرکزی کردار اخلاق ہے جو تقسیم ہند سے قبل یوپی کے ایک قصبے کا رہائشی تھا۔ تقسیم کے باعث اخلاق اپنی والدہ کے ساتھ ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے شہر لاہور میں آکر آباد ہوا۔ انتظار حسین کا ناول تذکرہ ایک ناول بھی ہے اور بیک وقت سوانح عمری بھی۔ انتظار حسین خود ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے ہندوستان سے لاہور آئے۔ انہوں نے ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے اُن مسائل کو قریب سے دیکھا جو تارکین وطن کو در پیش تھے، اسے سمجھا اور پرکھا پھر اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ انتظار حسین کا یہ ناول بھی ترک سکونت کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ "اس ناول کے بارے میں مصنف کا کہنا تھا کہ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر پہنچ کر تذکرہ لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔" [۳۵]

اس ناول کا مرکزی کردار اخلاق اور اس کی والدہ بوجان کا ہے اور ناول کی کہانی انہی کے گرد گھومتی ہے جو تقسیم ہند کی وجہ سے لاہور میں آکر آباد ہوئے۔ اخلاق کی اماں (بوجان) لاہور میں آجانے کے باوجود وہاں کے ماحول، رہن سہن کو قبول نہیں کر پاتی۔ وہ پاکستان تو رہ رہی ہے لیکن بوجان کی ذات کا ایک حصہ ماضی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ماضی میں گم دکھائی دیتی ہے۔ بوجان کو لاہور کی جدید زندگی پسند نہیں تھی اور نہ ہی اپنی روایات اور اقدار کی جگہ نئی اقداروں کو فوقیت دینا بوجان کو منظور تھا۔ بوجان کی جوانی چونکہ چراغ حویلی میں گزری اور جب وہ ترک سکونت کرتے ہوئے لاہور آئیں تو یاد ماضی اور وطن کی یاد نے بوجان کو ادھورے پن اور تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا کر دیا۔

> عجب ہوا کہ بوجان کے چپ ہونے کے ساتھ ہمارے گھر میں خاموشی نے ڈیرہ کر لیا۔ اس گھر میں بولنے، باتیں کرنے کا سلسلہ تو بوجان ہی کی کسی بات سے شروع ہوتا تھا۔ اے دلہن! اے بیٹے! اے لال! کبھی زبیدہ سے خطاب، کبھی مجھ سے خطاب! بس پھر شروع ہو جاتی تھیں۔ کوئی یہاں کی بات، کوئی وہاں کی بات۔ اگلے پچھلے قصے، کب کی کہانیاں، ایک ان کے دم سے کتنے زمانے، کتنے جگ اس گھر میں دم لے رہے تھے۔ وہ چپ ہوئیں تو جیسے اس گھر میں کرنے کے لئے کوئی بات نہیں رہی۔ سب زمانے روپوش ہو گئے۔ [۳۶]

بوجان نے چراغ حویلی میں پانچ پشتوں کو پروان چڑھتے دیکھا۔ ان کے لیے کسی دوسرے ملک میں نئے سرے سے آباد ہونا مشکل ترین امر ثابت ہوا۔ لاہور کے نئے گھر میں بھی بوجان چراغ حویلی کے صحن، ڈیوڑھی اور پرانی روایات کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ ترک وطن نے بوجان جیسے کردار کو ان کی اصل پہچان (شناخت) سے اکھاڑ کر رکھ دیا۔ انتظار حسین کے اس ناول میں بھی ترک وطن کرنے والے چراغ حویلی کے لوگوں کا کرب، اصل زمین سے دوری، آباؤ اجداد کی قبریں اور روایات و اقدار کے چھین جانے کا غم دکھائی دیتا ہے۔

انتظار حسین کا ناول آگے سمندر ہے ترک سکونت حوالے سے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس ناول کا موضوع ہندوستان سے ترک سکونت اختیار کرنے والوں کو بنایا گیا ہے۔ ناول میں ترک وطن کرنے والے جب ہندوستان سے کراچی آتے ہیں تو انہیں ہر طرف لالچ اور ہوس کا دور دورہ دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں ناول نگار نے دکھایا ہے کہ کراچی کے حالات اور وہاں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی ہلچل نے انسانی رشتوں میں خود غرضی اور مفاد پرستی کو جنم دیا ہے۔ مصنف نے کراچی شہر میں مختلف فرقوں، زبانوں اور بولیوں کو پروان چڑھانے والا شہر بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس شہر میں آکر سب کی تہذیب، روایات و اقدار گھل مل گئی ہیں۔ کسی کی اپنی پہچان، شناخت نہیں رہی۔ جیسے ناول میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ:

> میاں یہ شہر خصمی شہر ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچی، پٹھان، مہاجر۔۔۔۔ یاروں نے یہ شہر بسایا ہے، کھچڑی پکائی ہے۔ مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑی ہے۔ کوئی پورب کا کوئی پچھم کا، کوئی اتر سے آیا ہے، کوئی دکن سے چلا، سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور سمندر میں آکر مل گئیں۔۔۔ مگر اس میں کہاں۔۔۔۔ یہی تو مصیبت ہے ہر ندی کہتی ہے۔ میں سمندر ہوں۔[۲۳]

آگے سمندر ہے، ناول میں انتظار حسین نے ترک سکونت اور روایات و اقدار سے کٹ جانے والے کرب کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تارکین وطن کی ایک مخصوص سوچ کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس ناول میں بھی تارکین وطن کے بیان کردہ مسائل وہی ہیں جو انتظار حسین نے اپنے پہلے دو ناولوں بستی اور تذکرہ میں بیان کئے ہیں ۔یعنی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی، کرب، مایوسی، ناسٹلجیا وغیرہ۔ مجموعی طور پر انتظار حسین کی تحریروں میں شناخت کا بحران، روایات و اقدار کا زوال اور ماضی کی یاد نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا شمار اردو ادب کے اہم ترین سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں لکھنے کا آغاز سفر نامے سے ہی کیا۔ اس کے بعد وہ ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ مستنصر حسین بطور ایک کامیاب

ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ترک سکونت کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں دیس ہوئے پردیس، اے غزال شب،اہم ناول سمجھے جاتے ہیں۔

مستنصر حسین کا ناول دیس ہوئے پردیس ترک سکونت کرنے والے لوگوں کی نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ مستنصر کا یہ ناول دراصل ان لوگوں کی عکاسی کرتا ہے جو اپنے وطن سے دور رزق کی تلاش کے لیے کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہوئے۔ اس ناول کا مرکزی کردار برکت علی ہے، جو حصول رزق کے لیے بیرون ملک جابستا ہے اور وہاں شادی کر لیتا ہے۔ برکت علی بیرون ملک رہتے ہوئے بھی خود کو وہاں پر آباد نہیں کر پاتا ۔اسے اپنی روایات اور اقدار بے حد عزیز ہیں۔ناول سے اقتباس:

> ہم یہاں جڑیں پکڑ گئے ہیں جو گی اوئے جو گی۔۔۔۔ہم یہاں کے بوٹے نہیں ہیں پر جڑیں پکڑ گئے ہیں اب ہم نہ مرتے ہیں اور نہ بڑھ کر درخت بنتے ہیں۔۔۔۔۔بس اسی طرح کے اسی طرح رہتے ہیں۔ کھایا پیا اور اتنے ہی رہے جتنے تھے۔[۳۸]

ناول کا مرکزی کردار برکت علی بیرون ملک میں بظاہر ایک مکمل زندگی بسر کر رہا ہے لیکن در حقیقت وہ نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے۔وہ چاہتا ہے کہ جو روایات اور اقدار، تہذیب اسے اپنے آباؤ اجداد اور آبائی زمین سے ملی وہی تہذیب، روایات اور اقدار وہ اپنے بچوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ دیار غیر جا بسنے والے جب اپنے بچوں میں اپنی اقدار اور طرز معاشرت کو پروان چڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے تو وہ لوگ جلد ہی اداس، مایوس اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ناول میں بھی برکت علی کی انگریز بیوی اسے یوں سمجھاتی ہے:

> یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس معاشرے میں رہو اور اقدار کسی اور معاشرے کی اپناتے رہو۔ تم جہاں رہتے ہو اگر تم نہیں تو تمہاری اولادیں وہاں کا اثر ضرور قبول کرے گی یہ قدرتی بات ہے اور تمہیں اس کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔[۳۹]

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول اے غزال شب کا آغاز، ن۔م۔راشد کی نظم سے کیا ہے۔ جس کا عنوان ہی "اے غزال شب" ہے۔ مستنصر حسین کے ناول اے غزال شب کی کہانی چار کرداروں ظہیر الدین، عارف نقوی، سردار قالب اور مظہر الاسلام کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہے، جو پاکستان سے ترک وطن کرتے ہوئے بیرون ممالک میں جا کر آباد ہوئے۔ مصنف نے ناول میں دیار غیر میں جا بسنے والے تارکین وطن کی ان مشکلات و مصائب اور ذلت کی عکاسی کی ہے جو تارکین وطن کو درپیش تھیں۔ مستنصر کے اس ناول میں یہ محسوس کیا جاتا ہے

کہ تارکین وطن میزبان ملک میں اپنی جڑیں قائم نہیں کرسکتے۔وہ محسوس کرتے ہے کہ انہیں اپنے آبائی وطن واپس جانا ہے۔کیوں کہ ان کا آبائی وطن ہی ان کی شناخت ہے۔وطن سے وابستگی کا اظہار اے غزال شب میں یوں ملتا ہے:

> وطن دراصل وہ ہے جہاں۔۔۔آپ کے وجود کی ضرورت ہو۔۔۔آپ کو چاہنے والی کچھ ایسی روحیں موجود ہوں، جن کا گزارہ آپ کے بغیر نہ ہو سکے۔۔۔جس کی خوراک، آب و ہوا اور ثقافت کے آپ عادی ہو جائیں۔[۳۹]

بانو قدسیہ اردو ادب کی مشہور مصنفہ سمجھی جاتی ہیں۔انہوں نے اردو ادب میں اپنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے اپنی ایک الگ پہچان قائم کی ہے۔ترک سکونت کے حوالے سے لکھے گئے بانو قدسیہ کے ناول شہر بے مثال اور حاصل گھاٹ اہم سمجھے جاتے ہیں۔بانو قدسیہ کا ناول شہر بے مثال میں رشیدہ تعلیم کی غرض سے ترک سکونت اختیار کرتی ہے اور یہی ترک سکونت آگے جا کر رشیدہ میں نفسیاتی پیچیدگیوں نیز اپنی روایات اور اقدار سے دوری کا سبب بنتی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار رشیدہ ہے۔رشیدہ بہاولپور سے لاہور تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتی ہے اور شہر لاہور کے کالج میں ایم اے سائیکالوجی میں داخلہ لے لیتی ہے۔رشیدہ لاہور شہر کی رونق اور رنگارنگی سے متاثر ہو کر بہاولپور اور لاہور کا موازنہ یوں کرتی ہے "اس سفر میں رشو جان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر کوئی اسے لاس اینجلس کے دل ہالی وڈ میں گھسیٹ لایا ہو۔"[۴۰] رشیدہ کالج میں فیشن ایبل اور آزاد خیال لڑکیوں سے متاثر ہوتی ہے تو وہ خود بھی اسی طرز زندگی میں ڈھلنے لگتی ہے،وہ پردہ ترک کر دیتی ہے۔یوں رشیدہ کے کردار میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔اپنے ناول شہر بے مثال میں بانو قدسیہ اس خیال کو پیش کرتی ہیں کہ جب بہاولپور کی سیدھی سادی لڑکی لاہور میں آکر آباد ہوتی ہے تو وہ خود کو وہاں کے ماحول،رہن سہن اور وہاں کی زندگی میں ڈھلنے سے روک نہیں پاتی اور وہ روایات و اقدار جو اسے اپنے گھر،والدین اور آبائی شہر بہاولپور سے ملے تھے انہوں برقرار رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔رشیدہ لاہور آنے کے بعد اپنے روایات کو بھول کر شہر لاہور کی جدت، چال ڈھال، روشن خیال اور امیر زندگی کو اپنا لیتی ہے۔یوں وہ نئی اقدار اور روایات جو رشیدہ کو شہر لاہور میں ملتی ہیں اسے اپناتے ہوئے وہ ملک بختیار سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے،جو بعد میں رشیدہ کے لیے نفسیاتی پیچیدگیوں کا باعث بنتی تھی اور بہت جلد رشیدہ پہ پر آسائش زندگی کی چمک دمک کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جاتا ہے۔

آسائش میں بس ایک ہی قباحت ہے کہ پہلے انسان اس کا متمنی ہوتا ہے۔ پھر اس کا عادی ہو جاتا ہے اور بالآخر اسے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر نفسیاتی ہو جاتا ہے۔[۲۴]

رشیدہ شادی کے بعد نفسیاتی مسائل سے دوچار دکھائی دیتی ہے۔ اسے اپنے بہاولپور کی سادہ زندگی، پر خلوص لوگ، اپنی ماں، بہاولپور کی روایات اور اقدار اور اپنی حویلی سب یاد آنے لگتا ہے۔ لاہور شہر کی رونق اور رنگا رنگی کے باوجود رشیدہ میں عدم تحفظ کا احساس دکھائی دیتا ہے جو اسے تنہائی، کرب، یادماضی کی وجہ سے ذہنی مریض بنا دیتا ہے۔ بانو قدسیہ اپنے ناول شہر بے مثال میں روایات اور اقدار کی شکست وریخت کے اثرات کو بیان کرتی ہیں کہ کس طرح کسی بھی انسان کی زندگی میں اس کا وطن، تہذیب اور روایات و اقدار اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر انسان اپنی روایات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اور انہی روایات و اقدار کے پیچھے چھوٹ جانے سے وہ تذبذب اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی عنصر ہمیں رشیدہ کے کردار میں بخوبی دکھائی دیتا ہے کہ نئی زندگی اسے ذہنی انتشار، اضطراب اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں دیتی۔

بانو قدسیہ کا ناول حاصل گھاٹ ترک سکونت کے حوالے سے اہم ناول ہے۔ اس ناول میں بانو قدسیہ نے ترک سکونت کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے، نیز کرداروں کے ذریعے دو ملکوں کا تقابل بھی کیا ہے۔ بانو قدسیہ نے ناول کی کہانی کو واحد متکلم کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ہمایوں ہے جو ایک بوڑھا ریٹائر ہے۔ ہمایوں کی بیوی مر چکی ہے جب کہ اس کے دو بچے اپنی مادی ترقی، خوشحالی اور عیش و عشرت کے لئے پاکستان کو خیر باد کہہ کر امریکہ جا کر آباد ہو چکے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اس ناول حاصل گھاٹ میں دو طرح کی ترک سکونت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ناول میں پہلی ترک سکونت ہمایوں کی اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان کی طرف کی گئی ہے۔ جب کہ دوسری ترک سکونت ہمایوں کے بچوں کی بیرون ملک امریکہ کی طرف کی گئی ہے۔ یوں مصنفہ کے ناول کا بنیادی موضوع ہی ترک سکونت ہے۔ تقسیم ہند کی وجہ سے ہمایوں کا خاندان اپنی خوشیوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے پاکستان آتا ہے لیکن پاکستان آنے کے بعد انہیں وہ خوشیاں اور خواہشات میسر نہیں ہوتیں جن کا خواب دیکھ کر انہوں نے ترک سکونت کی۔ جس کا اظہار ناول میں یوں کیا گیا ہے:

ہمارے گھرانے پر پاکستان کے اور اللہ کے احسانات ہی احسانات تھے لیکن ہم نے اپنے شکوک و شبہات سے آستینوں میں چھپے بتان وہم گمان کی مدد سے زندگی میں زہر گھولنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔ ہم ان لوگوں سے خائف تھے جو ہماری طرح مہاجر اور بے یار و مددگار تھے

۔ہم ان تعلیم گاہوں سے خوفزدہ تھے جہاں پڑھانے والے اور ہم سبھی طالب علم ناآشنا چہروں والے تھے۔۔۔ہم شہر کی سڑکوں، بازاروں، بس سٹاپوں کو دیکھتے خوف کے چیتے ہمیں ہر موڑ پر، ہر نئی شکل میں کسی نئے واقع کی ہئیت میں ڈراتے۔ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف ناک چیتے لے کر آئے تھے۔۔۔

ان دیکھے خوف

ان جانے کا خوف

ان چکھے کا خوف

ان چاہے کا خوف

وہم گمان کا چیتا کئی شکلیں بنا کر ہمارے تعاقب میں رہتا اور ہم اس سے ایسے بھاگتے جیسے پولیس سے چور بھاگتا ہے۔نہ ہم کہیں ٹھہرتے، نہ کسی مقام سے آشنائی حاصل کر سکتے۔یوں پاکستان میں ہمارا سفر چیتا چھپٹی سے شروع ہوا۔[۲۳]

ہمایوں کا خاندان جو ترک سکونت کرتے ہوئے پاکستان آیا تو اسے اپنی زمین سے دوری، اپنے عزیز و اقارب اور وطن کی یاد نے آگھیرا۔ترک سکونت کرتے ہوئے ہمایوں کا خاندان پاکستان تو آبسا، لیکن اپنی روح اور خوشی وہی (دہلی) ہندوستان چھوڑ آیا۔جس کا ظاہر ناول میں ہمایوں کے دادا کے ذریعے ہوتا ہے جب وہ وطن کی جدائی اور اجنبیت کے کرب سے دوچار دکھائی دیتا ہے، اور ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے:

دادا زمین سے وابستہ کسان تھا۔اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی، وہ گاؤں چھوڑ کر آتو گیا تھا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے تک جی نہ سکا، اندر ہی اندر اسے گاؤں کے گھر، وٹ بنے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگی، پکی سڑک تک جانے والا کچا راستہ، کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈا کھیلتے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسی کے ڈول، مکھن بھرے سلور کے کٹورے یاد آتے رہتے۔۔۔۔دادا گلی میں چارپائی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن کن زاویوں سے یاد کرتا رہتا۔[۲۴]

مادی ترقی کی خواہش، خوشحال زندگی، عیش و عشرت اور آرام دہ زندگی کا خواب ہی انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دیار غیر میں پناہ لے۔جدید دور میں چین اور امریکہ ایسے ممالک ہیں جہاں لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ترک سکونت اختیار کر رہے ہیں۔ناول میں ہمایوں کے بچے اپنی اسی ترقی اور خوشحالی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے امریکہ چلے جاتے ہیں اور وہ امریکیوں کی طرح جینز اور ٹی شرٹ پہنتے ہیں، وہ وہاں کے

کلچر اور تہذیب و ثقافت کے دلدادہ ہیں اور اپنی تہذیب، روایات کو امریکہ میں اپناتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ ناول میں جب ہمایوں فرید اپنی بیٹی سے وطن (پاکستان) واپس جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو ارجمند کہتی ہے کہ:

> ابو آپ بھول رہے ہیں، ہم پاکستان کے عذابوں سے نکل کر یہاں آئے ہیں۔ آپ مجھے واپس اسی گھٹے گھٹے ماحول میں گرمی اور دھول میں، احمق، جاہل اور تنگ نظر لوگوں میں بلا رہے ہیں۔ اتنے exposure کے بعد میں کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہتی۔[۵۵]

ناول حاصل گھاٹ میں بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ تارکین وطن جب کسی بیرون ملک جاتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی روایات اور اقدار کو بدلتے ہیں بعض دفعہ یہ عمل اختیاری ہوتا ہے اور بعض دفعہ جبری، تارکین وطن امریکہ پہنچ کر اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، پھر لباس، زبان اور خوراک سے، اور اس سب تبدیلی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ میزبان ممالک میں خود کو اجنبی بن کر لوگوں کی نظروں میں مشکوک نہیں بننا چاہتے۔ جس کا اظہار ناول میں ارجمند اور اس کے والد کی گفتگو سے کیا جاسکتا ہے۔

> ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا۔۔۔"تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟" ارجمند کچھ دیر زبان منہ میں گھومتی رہی۔ شاید مجھے وہ اپنی بات سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "بات یہ ہے ابو۔۔۔۔ انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔ میں شلوار قمیض میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔۔ main stream سے کٹ جاتا ہے آدمی" "لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے ناں ارجمند" "ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔۔ لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ کو کمتر جانتے ہیں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے، نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔"[۵۶]

بانو قدسیہ نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے بتایا ہے کہ انسان جب اپنے وطن سے نکل کر دوسرے ملک جاتا ہے تو کچھ عرصے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اجنبی ماحول، اجنبی لوگ اور مختلف کلچر اسے پریشان کرتے ہیں۔ میزبان ممالک میں تارکین وطن کی کوئی اپنی شناخت نہیں ہوتی اور وہ احساس کمتری، عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے ناولوں میں بانو قدسیہ یہی نظریہ پیش کرتی ہیں کہ ہر انسان اپنے وطن، اپنی روایات اور اقدار کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اور یہی روایات اور اقدار نہ رہے تو انسان کی اپنی کوئی پہچان نہیں رہتی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو ناولوں میں ترک سکونت کے رجحانات اپنی زمین، عزیز و اقارب سے جدائی کے غم، اپنی روایات اور اقدار کے نابود ہونے کے کرب اور شناخت کے بحران کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

اردو ناول نگاروں نے ترک سکونت کے انہی رجحانات کو بنیاد بناتے ہوئے تارکین وطن کی ذہنی و جسمانی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں ترک سکونت اور اس سے وابستہ عوامل کا اظہار ان ناول نگاروں کے ہاں قدر مشترک کے طور سامنے آتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ شیخ منیر احمد،تہذیبی رویے (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۴ء)،ص ۲۵۱۔

۲۔القرآن،سورۃ آل بقرہ،پارہ نمبر ۲، آیت نمبر ۲۱۸۔

۳۔محمد جوناگڑھی، مترجم "تفسیر ابن کثیر" ترجمہ القرآن الکریم(لاہور:مکتبہ رحمانیہ اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ،۲۰۱۸)،ص ۲۹۸۔

۴۔القرآن،سورۃ النساء،پارہ نمبر ۴، آیت نمبر ۱۰۰۔

۵۔محمد جوناگڑھی،مترجم "تفسیر ابن کثیر"ترجمہ القرآن الکریم،ص ۶۳۲۔

۶۔القرآن،سورۃالاعراف،پارہ نمبر ۸، آیت، نمبر ۲۴۔

۷۔محمد عنایت اللہ، مترجم "کنز العرفان" ترجمہ القرآن الکریم(اوکاڑہ:شعر القرآن منزل جناح روڈ، ۲۰۰۸ء)،ص ۳۷۱۔

۸۔سید قاسم محمود، مرتبہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا(کراچی: شکار بک فاؤنڈیشن،۱۹۸۴ء)،ص ۳۹۱۔

۹۔القرآن،سورۃ الصفت،پارہ نمبر ۲۳، آیت نمبر ۹۹۔

۱۰۔محمد عنایت اللہ،مترجم "کنز العرفان" ترجمہ القرآن الکریم،ص ۱۰۳۔

۱۱۔القرآن،سورۃ اشعر،پارہ نمبر ۱۹، آیت نمبر ۵۴،۵۳،۵۲۔

۱۲۔محمد عنایت اللہ،مترجم "کنز العرفان" ترجمہ القرآن الکریم،ص ۹۱۰۔۹۱۱۔

۱۳۔صفی الرحمن مبارک پوری،الرحیق المختوم(لاہور:مکتبہ السلفیہ،س۔ن۔)،ص ۱۳۲۔

۱۴۔روبینہ الماس،اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار(مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۲)، ص ۲۰۔

۱۵۔فیروزالدین،فیروز اللغات(فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور، ۲۰۱۰)،ص ۲۳۶۔۴۶۳۔

۱۶۔سید احمد دہلوی ، مرتبہ فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، چہارم (مشترک جلد)(لاہور: اردو سائنس بورڈ ، طبع ششم،۲۰۱۰ء)،ص ۶۲۵۔۷۰۴۔

۱۷۔ قائم رضا نسیم ، مرتضی فاضل لکھنوی (مرتبین)نسیم اللغات(لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۲۰ ۔۶۲۹۔

۱۸۔نورالحسن نیر،نور اللغات (جلد دوم)(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۱۷ء)،ص ۱۹۲۔

۱۹۔http://udb.gov.pk/result.php?search=%D8%AA%D8%B1%DA%A9+%D8%B3%DA%A9%D9%88%D9%86%D8%AA%، تاریخ ملاحظہ:۱۲دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۰۔https://www.merriam-webster.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۲ دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۱۔۔ ۔https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۳دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۲۔https://www.vocabulary.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۵ دسمبر ۲۰۲۱ء۔

۲۳۔https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/english/displacement?q=displacement تاریخ ملاحظہ:۱۶دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۴۔https://www.lexico.com/definition/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۷دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۵۔https://www.yourdictionary.com/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۸دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۶۔https://www.wordreference.com/definition/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۰دسمبر ۲۰۲۱ء۔

۲۷۔ https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۲ دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۸۔https://www.ldoceonline.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۵دسمبر۲۰۲۱ء۔

۲۹۔سید وقار عظیم،داستان سے افسانے تک(کراچی:اردو اکیڈمی،۱۹۶۶ء)،ص ۲۸تا۲۹۔

۳۰۔عبداللہ حسین،اداس نسلیں(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)،ص ۱۴۰۔

۳۱۔خدیجہ مستور،آنگن(علی گڑھ:ایجوکیشن بک ہاؤس،۱۹۸۳ء)،ص ۳۳۱۔

۳۲۔خدیجہ مستور، زمین(ادارہ فروغ لاہور،۱۹۸۴ء)،ص ۷۵۔

۳۳۔ایضاً۲۷۔

۳۴۔ انتظار حسین،بستی(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۶۴ء)،ص۹۹۔

۳۵۔ ارتضی کریم ،مرتب انتظار حسین ـــــ ایک داستان(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۱۹۹۹ء)،ص۳۷۶۔

۳۶۔ انتظار حسین، تذکرہ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء)،ص۲۲۶۔

۳۷۔ انتظار حسین،آگے سمندر ہے(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص۳۹۔

۳۸۔ مستنصر حسین، دیس ہوئے پردیس (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء)،ص۲۲۵۔

۳۹۔ ایضاً،ص۲۳۳۔

۴۰۔ مستنصر حسین،اے غزال شب(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،ص۲۲۱۔

۴۱۔ بانو قدسیہ،شہر بے مثال(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص۵۔

۴۲۔ ایضاً،ص۲۵۹،

۴۳۔ بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص۳۶۔

۴۴۔ ایضاً،ص۲۱تا۲۲۔

۴۵۔ ایضاً،ص۵۲۔

۴۶۔ ایضاً،ص۳۸۔

باب دوم:

حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کا بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے مسائل کا مطالعہ

باب دوم:

حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کا بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا مطالعہ

ترک سکونت ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگوں کی نقل و حرکت کرنے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ لوگوں کا کسی نئی جگہ سکونت اختیار کرنے کا عمل مستقل ہو سکتا ہے اور عارضی بھی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی خطہ، کوئی بھی ملک ایسا نہیں جہاں سے لوگوں نے ترک سکونت اختیار نہ کی ہو، یوں ترک سکونت پوری دنیا میں ایک تیزی سے پھیلنے والا رجحان ساز تصور بن گیا ہے۔ اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی وجوہات کی بنا پر ایک ملک یا براعظم کے لوگوں کا دوسرے ملک یا براعظم میں نقل مکانی کرتے رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستان نے بیسویں صدی کو نقل مکانی کی صدی قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

> بیسویں صدی ترک وطن کی صدی ہے اس صدی کے دوران میں ایک براعظم سے دوسرے براعظم، ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر میں لوگوں کی منتقلی اور عارضی سکونت روز مرہ کا معمول بن چکی ہے۔[1]

ترک سکونت کا عمل صرف انسانوں تک محدود نہیں ہوتا ہے بلکہ ترک سکونت اختیار کرنے والوں میں کیڑے مکوڑے، جانور، چرند، پرند، حیوانات اور نباتات بھی شامل ہوتے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے انشایئے میں لکھتے ہیں کہ:

> migratory birds رزق کی تلاش میں ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں۔ جانور خوراک کی تلاش میں اور درندوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے ٹھکانے بدلتے ہیں۔ پرندوں، ہواؤں اور آندھیوں کے ذریعے سے ایک علاقے کی فصل دوسرے علاقے تک پہنچتی ہے۔[2]

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً ہر جاندار شے ترک سکونت کے تجربے سے گزرتی ہے۔

ترک سکونت انسانی ذہن پر جو نقوش چھوڑتی ہے اس کے اثرات تارکین وطن پر تا عمر جاری و ساری رہتے ہیں۔ ترک سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے تارکین وطن کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، روایات، اقدار، معاشرت اور معیشت سبھی پر اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں، لیکن ترک سکونت اختیار کرنے کے نتیجے میں تارکین وطن کا نفسیاتی

پہلو سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ تارکین وطن ترک وطن کرتے وقت دوران سفر کے حالات وواقعات کو، نفسیاتی مسائل، مشکلات اور تلخیوں کو اپنے ذہن سے مٹا نہیں پاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ناولوں میں جن مصنفین نے ترک سکونت کے مباحث، نفسیاتی پیچیدگیوں اور اس کے دوران پیش آنے والے مسائل کو سمجھا، پرکھا اور لکھا ان میں سے ایک اہم نام حسن منظر کا ہے۔ حسن منظر کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہ صرف پیشہ ورانہ حیثیت سے طبیب ہیں بلکہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مترجم اور ناول نگار بھی ہیں۔ حسن منظر اکیسویں صدی میں ناول کی صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ ناول نگاری کے حوالے سے حسن منظر کا اسلوب ناقابل تقلید ہے۔ ان کے ناولوں میں جذبات واحساسات، تہذیب وثقافت اور اقدار کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں نفسیاتی حقائق کو خوبی سے پیش کیا ہے۔ حسن منظر کے افسانے ہوں یا ان کے ناول دونوں ہی انسانی نفسیاتی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ حسن منظر کی شعبہ نفسیات سے وابستگی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں معاشرتی ناہمواریاں، احساس کمتری کا شکار لوگ، منافقت پر مبنی سماج کی عکاسی، سیاسی جبر واستحصال، پاکستانی سماج میں کرپشن، خوف، کرب، جنس، ناسٹلجیا، دھوکہ، ڈائیاسپورا اور نسلی تعصب جیسے موضوعات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

ترک سکونت کا مطالعہ بھی ان کے ناولوں میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں تارکین وطن کے جن مسائل کو موضوع بنایا۔ ان میں شناخت کا بحران، اپنی زمین سے دوری کا احساس، ماضی پرستی سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ، تنہائی، مایوسی، خوف، کرب، اجنبی لب ولہجے اور ذہنی انتشار جیسے مسائل شامل ہیں۔ اس باب میں حسن منظر کے ناولوں میں انہی مسائل (شناخت کا بحران، اپنی زمین سے دوری کا احساس، ماضی پرستی سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ، تنہائی، مایوسی، خوف، کرب، اجنبی لب ولہجے اور ذہنی انتشار) کا مطالعہ کیا جائے گا۔

کسی بھی انسان کی روایات واقدار، تہذیب وثقافت اور عقائد اُس کی پہچان یا شناخت ہوتے ہیں۔ شناخت میں وہ تمام تجربات، خیالات، رشتے اور یادیں شامل ہوتیں ہیں جو کسی بھی شخص کے نفسی احساسات کو جنم دیتی ہیں اور یہی نفسی احساسات آگے جاکر کسی بھی شخص کی شخصیت (Identity) بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یوں شناخت کسی بھی شخص کی ذاتی خصوصیات کا وہ مجموعہ ہوتی ہے جو اُسے مکمل بناتی ہے۔ آسان الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شناخت وہ چیز ہے جو کسی بھی شخص کو منفرد یا مخصوص بناتی ہے یعنی شناخت ہی انسان میں انفرادیت اور خوداعتمادی پیدا کرتی ہے۔ شناخت کے بارے میں ایرکسن کا کہنا ہے کہ:

"Fundamental organising principle whichDevelops constantly throughout the lifespan."[۳]

ایر کسن کے نزدیک شناخت کو ایک بنیادی تنظیم سازی کا عنصر کہا جاسکتا ہے جو کسی بھی شخص کی شخصیت بننے میں مدد دیتی ہے اور یہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہتی ہے۔ایر کسن کا مزید کہنا یہ بھی ہے کہ شناخت کو بنانے کے لیے ہم اپنے معاشرے سے کچھ چیزیں قبول کرتے ہیں اور کچھ چیزوں کو رد کرتے ہیں، لیکن ہمارے رشتے، مذہب و عقائد اور روایات و اقدار ایسے عناصر ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتے رہتے ہیں اور انہیں چھوڑا نہیں جاسکتا اور جو لوگ ان عناصر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ شناخت کے بحران کا شکار ہوتے ہیں۔

حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کی نفی کے مسائل:

شناخت کا بحران اس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی شخص اپنی ملازمت، یا پھر اپنا کوئی عزیز کھو دیتا ہے۔مایوسی، اداسی، بے چینی، اضطراب اور کرب جیسی کیفیات بھی شناخت کے مسائل کو جنم دیتی ہیں۔اس کے علاوہ اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک منتقلی بھی شناخت کے بحران کا سبب بنتی ہے۔کیوں کہ بیرون ملک منتقلی سے وہ لوگ اپنے آباؤاجداد کی سرزمین، روایات، تہذیب و ثقافت اور خاندان کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں تو یہ سب چیزیں مل کر شناخت کے بحران کو اجاگر کرتی ہیں۔ شناخت کے بحران کی یہی کیفیت ہمیں حسن منظر کے مختلف ناولوں میں نظر آتی ہے۔

شناخت کا یہی مسئلہ ہمیں حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں "احمد بخش" کے کردار میں دکھائی دیتا ہے۔جب وہ اپنے آباؤاجداد کی سرزمین کو چھوڑ کر امریکہ آباد ہو جاتا ہے۔احمد بخش امریکہ میں کافی عرصے سے رہنے کے باوجود خود کو وہاں ادھورا اور نامکمل محسوس کرتا ہے۔اس کے ذہن میں یہی سوچ اور خیالات موجود ہوتے ہیں کہ یہاں اس کی کوئی پہچان واضح نہیں ہے، وہ بیرون ملک اپنے وجود کے ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت سے دوچار دکھائی دیتا ہے۔شناخت کے بحران کی یہی کیفیت احمد بخش کے کردار میں خوف کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور یہی بات احمد بخش کو خوف میں مبتلا کیے رکھتی ہے کہ:

> تو کیا میں یہاں اکیلا رہوں گا۔ایک دن اپنے بیڈروم میں مردہ پایا جاؤں گا اور لوگ فیصلہ کریں گے اس کا کوئی مذہب نہیں تھا نہ کوئی قریبی رشتے دار ہے اس لیے انسانی ہمدردی میں مجھے میرے بہترین سوٹ، سوکس، جوتوں اور اچھی استارچ لگی قمیض اور ٹائی میں کریے ٹوریئم لے جائیں گے۔اس کام کا سرٹیفکیٹ انھیں اس برتے پر مل گیا ہوگا کہ موت نہ ارادی ہے، نہ حادثاتی، دل کی

نالی میں خون جمنے سے مر گیا۔ وہ کریے ٹوریئم سے میری راکھ بھی نہیں لیں گے، وہ ان کے کس کام کی ہو گی۔ میں، مجھے لگتا ہے، اپنے پیچھے نہ نام چھوڑ جاؤں گا نہ نشان۔[۳۷]

شناخت کے مسائل سے دوچار شخص اکثر خود کو کٹہرے میں کھڑا محسوس کرتا ہے۔ وہ خود سے ہی یہ سوالات کرتا رہتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری اقدار کیا ہیں؟ اور معاشرے میں میرا کردار کیا ہے؟ یا پھر میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا کردار خود سے یہ تمام سوالات کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خود کی زندگی سے بےزار ہے۔ اپنے ملک کے بے حس معاشرے سے فرار حاصل کر کے بیرون ملک آیا تو یہاں بھی وہ بے شناخت ہے۔

> اس کے ذہن میں خود بخود وہ حقیقت بھرا خیال ابھرتا تھا کہ وہ ملک ویسے کا ویسا ہو گا۔ یہ کرب کہ وہاں تھا تو وہاں کی زندگی سے بے زار تھا، یہاں ہوں تو یہاں کی زندگی سے۔ ایسے تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔ جیسے ایک گود لیا ہوا بچہ بڑے ہو جانے پر سوچتا ہو "آخر میں ہوں کس کا؟"[۳۸]

امریکہ میں رہتے ہوئے احمد بخش کی ملاقات کھونگ چوک وان سے ہوتی ہے جہاں وہ احمد بخش سے یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ میری روح کھو گئی ہے۔ وہ بیرون ملک اپنے وجود کو تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے وجود میں خالی پن، خلا اور گمشدگی کا سبب بیرون ملک کے ویرانے ہیں کیونکہ بیرون ملک رہنے والا ہر شخص اپنی زندگی میں مصروف ہے۔ وہاں کے لوگوں میں مہمان نوازی، دوسروں کے ساتھ میل جول کم دکھائی دیتا ہے۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہوتے ہیں جب کہ اس کے برعکس چین اور پاکستان ایسے ممالک ہیں جہاں بیرون ملک سے اگر کوئی بھی آتا ہے تو اس کی مہمان نوازی، دل جوئی کی جاتی ہے کہ وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس نہیں کرتے ہیں۔ کھونگ چوک وان بیرون ملک شناخت کی نفی کی وجہ سے اپنے وجود کے خالی پن اور گمشدگی کو بیان کرتے ہوئے احمد بخش سے کہتا ہے کہ:

> ہم ویرانے اور آبادی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ امریکا جذبات کا ویرانہ ہے، چین اور تمہارے ملک اخوت کے سمندر ہیں جن میں کوئی خود کو گم نہیں کر سکتا ہے۔ لاکھ ہاتھ چھڑاؤ کوئی نہ کوئی پکڑ لے گا۔[۳۹]

شناخت کی گمشدگی کا مسئلہ ہمیں حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں لوہ کائی لان اور کھونگ چوک وان کے کرداروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جو اپنے وجود کی گمشدگی کا شکار ہیں۔ بیرون ملک رہتے ہوئے لوہ کائی لان اور کھونگ چوک وان نہ صرف اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں بلکہ انہیں وہاں اپنے وجود کے خالی پن کا

احساس بھی ستانے لگتا ہے۔اپنے وجود کی گمشدگی اور خالی پن سے تنگ آکر لوہ کائی لان واپس اپنے وطن چین چلی جاتی ہے۔ناول دھنی بخش کے بیٹے میں لوہ کائی لان کے کردار میں شناخت کا بحران بیرون ملک رہتے ہوئے عدم تحفظ اور اکیلے پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔کھونگ چوک وان کائی لان کی اپنے وطن واپسی کا ذکر احمد بخش سے یوں کرتا ہے۔

> چوک وان نے کہا، "اس کا خوف اسے چین لے گیا جہاں سے وہ گیارہ بارہ کی عمر میں آئی تھی۔ وہاں اس کی بھائی کی اولاد ہے۔ بہنیں ہیں۔یہاں رہتی تو مینٹل اسپتال میں اسے پناہ دی جاتی۔یہاں ایک بڑی عجیب بات ہے۔جس کے مسائل کا حل نہ ہو اسے مینٹل اسپتال پہنچا کر سوسائٹی کا ضمیر آرام سے سو جاتا تھا۔ سوائے ایک صورت کے: وہ شخص مینٹل اسپتال پہنچائے جانے سے پہلے خودکشی کر لے۔پھر سوسائٹی کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ [۷]

حسن منظر کے ناول ماں بیٹی میں کلیرس کا کردار بھی شناخت کے بحران کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ کلیرس کے کردار میں شناخت کی نفی کا مسئلہ مذہب کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔کلیرس اپنے وجود اور پہچان کی تلاش میں گھوم ہے۔اس کا کردار اپنے اندر ایک خالی پن اور خلا کو محسوس کرتا رہتا ہے۔اپنے وجود کے خالی پن اور خلا کو مکمل کرنے کے لیے کلیرس مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتی ہے کہ شاید مذہب ہی اس کے اندر موجود خلا کو پُر کر سکے۔اپنے وجود میں خلا کو محسوس کرتے ہوئے کلیرس اپنی بیٹی سے کہتی ہے کہ:

> میں ماں کی زندگی میں پہلے مذہب سے برگشتہ ہوئی، پھر مختلف مذاہب کے بارے میں لائبریری سے لے لے کر کتابیں پڑھنے لگی۔ایسا لگتا تھا میرے اندر کئی پشت کا خلا ہے جو شاید مذہب پُر کر دے اور واقعی ایک کتاب مجھے ایسی مل گئی۔اس کے بعد کولج کے پڑھائی سے میرا جی اکتا گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا ہماری مالی حالت تعلیم کو کسی بھی منزل پر ختم نہیں کرنے دے گی، ادھر میں رہ جائے گی۔بچی ہوئی فیس کی مدت کا اندازہ کر کہ میں نے زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنا شروع کیں۔حقیقت میں ان دنوں میں خود کو کہیں کا بھی نہیں پا رہی تھی نہ اس کمیونٹی کی جس کی میری ماں تھیں، نہ اس کی جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ [۸]

کلیرس کی ماں کا تعلق کرسچن کمیونٹی سے ہوتا ہے۔ناول میں کلیرس اپنے مذہب سے مطمئن نہیں ہوتی اور اس لیے وہ مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتی ہے اسی دوران ہیدوران کولج میں کلیرس کی ملاقات حمزہ سے ہوتی ہے اور کلیرس اسلام قبول کرتے ہوئے حمزہ سے شادی کر لیتی ہے۔ناول میں حمزہ سے شادی اور اس کی

وفات کے بعد کلیرس کا کردار دوہری شناخت کے عذاب سے دوچار ہو جاتا ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد کلیرس کے پاس ذریعہ آمدنی کچھ بھی نہیں ہوتی کہ جس سے وہ اپنا اور اپنی بیٹی کا خرچا اٹھا سکے۔گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کلیرس کرسچن کمیونٹی سے مدد مانگتی ہے لیکن چونکہ کلیرس اپنا مذہب بدل لیتی ہے تو مذہبی تبدیلی کی وجہ سے کرسچن کمیونٹی اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیتی ہے بلکہ اس پر دباؤ ڈالتی رہتی ہے کہ وہ واپس کرسچن مذہب کو اپنا لے۔کلیرس کے مسلمان بیوہ اور تنہا ہونے کی وجہ سے معاشرے کے لوگ اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے کے کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس کے دوہرے مذہب کے بارے میں باتیں بنانے لگتے ہیں۔

> کچھ لوگوں کو کلیرس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی کہ یہ عورت جو عیسائی سے مسلمان ہوئی۔اب مسلمانوں میں بے سہارا تھی اور اس کے عیسائی رشتے دار اس کے لیے اس وقت تک کچھ بھی کر نے کو تیار نہیں تھے کہ جب تک وہ یسوع کے گلے میں واپس نہیں آ جاتی۔دفتر والوں نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر وہ واپس چرچ میں چلی گئی تو حمزہ کی بیٹی خود بخود عیسائی بن جائے گی۔[9]

آصف فرخی حسن منظر کے دو مختصر ناولوں بیر شیبا کی لڑکی اور ماں بیٹی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> بیر شیبا کی لڑکی، میں تو خیر منظر بدلا ہوا ہے مگر "ماں بیٹی" کی فضا بھی پوری طرح مانوس نہیں ۔ریبکا تو اپنے ہم وطنوں سے دور ہے۔مگر ماں بیٹی کے لئے اپنے ہم مذہبوں کی موجودگی بھلا کس بات کی تلافی کر پاتی ہے۔الٹا ایک اور عذاب بن جاتی ہیں۔"[10]

تارکین وطن جب ترک وطن کرتے ہوئے کسی دوسرے ملک میں آباد ہوتے ہیں انہیں جلد ہی میزبان ممالک میں شناخت کا مسئلہ آگھیرتا ہے تو وہ خود کو میزبان ممالک میں تنہا اور اجنبی محسوس کرتے ہیں۔تارکین وطن کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ میزبان ممالک میں بے نام اور گمشدگی کی زندگی جی رہے ہیں۔ان کی کوئی شناخت ہی موجود نہیں ہے جن سے وہ پہچانے جائیں گے۔

حسن منظر کے ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ناول نگار نے ریبکا کے کردار کے ذریعے سے اُن یہودی لوگوں کی کیفیت کو بیان کیا ہے جو نازی حکومت کے ظلم و ستم کے خوف سے اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں ترک سکونت کر گئے۔یہ یہودی لوگ(diaspora)اپنی زمین سے دور ہو جانے کی وجہ سے اپنی شناخت اور پہچان سے بھی دور ہو گئے اور بعض یہودی اپنی زمین میں رہتے ہوئے بھی خود سے ہی یہ سوال کرنے پر مجبور ہوئے کہ آخر وہ ہیں کس زمین کے؟اور وہ کس زمین کو اپنا کہیں گے۔

انہیں ہر دم خود کو یقین دلاتے رہنا پڑتا تھا کہ وہ یہاں کے ہیں، یہاں سے کبھی رخصت نہ ہونے کے لیے۔ کیوں، بس زمین کے اتنے ٹکڑے ہی کو کیوں، خود کو ساری زمین کا نہیں سمجھ سکتے تھے؟ جس طرح پوری دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودی (diaspora) زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں کھینچ بلائے گئے تھے اور اس میں سمانے کی کوشش کر رہے تھے، میرے تصور سے باہر تھا۔ جو یہودی گورے نہیں تھے زندگی سے بے زار نظر آتے تھے۔ وہ اتنے خوش قسمت نہیں تھے کہ امریکا یا اپنے وطن پھر سے اڑ جائیں۔ میرا خیال ہے وہ اپنی قسمت کو روتے ہوں گے کہ کہاں آن چھپے۔[۵۱]

ناول بیر شیبا کی لڑکی میں شناخت کا بحران مذہبی اور جغرافیائی حدود کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جب ۱۹۳۹ء کی جنگ میں ربیکا کے والدین اسے کسی کرسچن فیملی کے حوالے کرنے کے بعد خود موت کی طرف (نازیوں حکومت کے ساتھ) چل پڑتے ہیں۔ اپنے والدین، اپنی زمین اور مذہب میں تبدیلی ربیکا کے کردار میں ایک خلا کو پیدا کر دیتی ہے جو اس کے کردار میں شناخت کے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ ناول میں ربیکا کے والدین کا تعلق یہودی النسل سے تھا اور اس کے والدین نازی حکومت کے خوف کی وجہ سے اسے کرسچن فیملی کے سپرد کر دیتے ہیں تو یہاں سے ربیکا کے کردار میں اپنی شناخت کی بقا کو قائم رکھنے کے لیے کشمکش اور ذہنی جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور وہ خود کو عیسائی اعتقادات سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے۔ کیوں کہ یہودی لوگوں کا ماننا ہے کہ ان کے خون میں کوئی دوسرا خون شامل نہیں ہو سکتا۔ یوں ان کا خون بے میل ہے۔ اپنے یہودیت مذہب کے بارے میں ربیکا داؤد سے کہتی ہے کہ:

میرے دوسرے ملنے والے خود کو اسرائیلی بتاتے تھے اور اس کے دعویدار تھے کہ ان کا خون بے میل تھا۔ یعنی نسل جاری رکھنے میں ان کے پرکھوں میں سے کسی نے گڑبڑ نہیں کی تھی۔ سب حضرت نوح کی کشتی میں سے اترنے والوں میں سے تھے۔۔۔۔ اور ان میں سے کسی کا ارادہ آنے والی نسل کو بے میل رکھنے کے لیے کسی قسم کی گڑبڑ کا نہیں تھا۔[۵۲]

ربیکا کے کردار میں شناخت کا مسئلہ اس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب وہ غیر یہودی النسل کے مردوں سے تعلقات بنانے لگتی ہے۔ اسی دوران ربیکا کی ملاقات ڈاکٹر ایڈے یمی سے ہوتی ہے اور وہ ڈاکٹر ایڈے یمی سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن ایک دن ایڈے یمی ربیکا کو بتائے بغیر اپنے ملک واپس چلا جاتا ہے تو ربیکا کا کردار دوہرے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس میں ربیکا کو ڈاکٹر ایڈے یمی کے ہاتھوں اپنے وجود کی نفی کے ساتھ ساتھ اپنے خون میں

ملاوٹ کا احساس بھی ستانے لگتا ہے اور یہی احساس ربیکا کو ذہنی اذیت میں مبتلا کئے رکھتا ہے۔ مہرونہ لغاری ربیکا کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ربیکا اپنے ضمیر کی اس آواز سے تنگ ہے جو ایک یہودی عورت کے اپنے خون کو میلا کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ اب خالص خون کا تسلسل نہیں رہا۔ وہ چھوٹے ڈیوڈ کے ان سوالات سے بھی پریشان ہے۔ جو اپنے رنگ اور باپ کے متعلق کرتا رہتا ہے۔ [۳۱]

ترک سکونت کے بعد تارکین وطن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی شناخت کی نفی کا سامنے آتا ہے۔ ناول العاصفہ کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو اپنے ملک، گھر کے حالات کے سے تنگ آکر ترک وطن کر کے ایک نئے علاقے میں سکونت اختیار کر لیتا ہے اور یہی ترک سکونت اس کے لیے شناخت کا مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے۔ شناخت کی نفی کا احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب وہ اپنے ماضی، وطن سے وابستہ چیزوں اور لوگوں کو بھولا نہیں پاتا ہے۔ نئی سر زمین میں ہونے کے باوجود اس کا وجود پرانی جگہوں اور لوگوں سے وابستگی کے سبب کرب میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے موجود کے اضمحلال کی کیفیت ہی زید کے کردار میں شناخت کے بحران کا مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔

> میں ج آئل کمپنی میں ملازم تھا اور گھر سے دور ہونے کی وجہ سے گھر کی تمام فکروں سے دور تھا، کہ ہی میں میں نے سگریٹ پینا شروع کی تھی کیونکہ سگریٹ ایک طرح کی ذہنی آزادی کا نشان ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے لگتا تھا کہ میرے باپ کے ہمیشہ پھیلتے ہوئے کنبے کا بے رحم سورج کچھ دنوں کے لیے میرے سر پر سے ہٹ گیا ہے۔ اور میں بے فکری کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔۔۔ ہر بے فکر کی طرح میرے اچھے دنوں میں بھی یہ برائی تھی کہ بہت جلد گزر گئے۔۔۔۔۔۔ میں نے ایک دن اپنے آپ کو پوسٹ آفس کے باہر کھڑے پایا۔۔ اور میں کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا[۳۲]

وجود کے عدم یقین کی کیفیت ناول انسان، اے انسان کے تلمیذ الرحمن میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے وجود کی گمشدگی دراصل تلمیذ الرحمن کے ماحول کی دین ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول سے اجنبیت ہی تلمیذ کے وجود کو عدم استحکام کا شکار بن دیتی ہے، جو اس کے وجود کے اندر ایک بحرانی کیفیت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ جس کا اظہار تلمیذ کے کردار میں یوں دکھائی دیتا ہے۔

بہن کے گھر آ کر بہت سی آزادیاں چھن گئیں پھر بھی وہاں کے سارے چہرے سے دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن راجد ھانی کا یہ اسکول ایک دوسری دنیا تھی۔۔۔۔۔ وقفے میں سب باہر چلے جاتے وہ اکیلا وہیں بیٹھا رہتا۔ کوئی اس سے باہر چلنے کے لیے نہیں کہتا تھا۔۔۔ تلمیذ کے لیے وہ وقت سب سے زیادہ خوف ناک بن گیا۔۔ تلمیذ کا جی چاہتا: بھاگ کھڑا ہو۔ اس سکول سے بھی اور بڑی آپا کے گھر سے بھی۔ اور کہاں جاؤں؟ دوسرا خیال ہوتا۔ نینی پور؟ وہاں سے تو نکالا ہوا ہوں [۱۵]

ناول حبس میں بھی منصف نے ان یہودیوں کی طرز زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ جو مغربی استعماریت کے ظلم و تشدد اور قتل عام کے سبب دنیا بھر میں دربدری کی زندگی گزرانے پر مجبور ہوئے۔ ناول حبس میں بھی شناخت کا مسئلہ ان یہودیوں میں اپنی زمین سے بے جڑ ہونے کے احساس کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

ناول حبس کی کہانی بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایریئل شیرون ہے، جو اسرائیل کا پہلا وزیر دفاع اور گیارہواں وزیر اعظم تھا۔ ناول میں شیرون کا کردار ان یہودی ڈائیا سپوراک لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو نازی حکومت کے ظلم و تشدد سے متاثر ہو کر دوسرے ممالک میں سکونت اختیار کر گئے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں کی جانے والی یہ ترک سکونت ہی ان یہودی ڈائیا سپوراک میں شناخت کے بحران کا سبب بنی۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک میں پھیلے یہودی ڈائیا سپوراک ہمیشہ بے جڑ اور اپنی زمین سے دوری کے کرب میں مبتلا رہے۔ یوں بے جڑ ہونے کا احساس ہی یہودی ڈائیا سپوراک لوگوں میں شناخت کے بحران کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا۔

حسن منظر کے ناول حبس کا موضوع بھی ترک سکونت ہے۔ منصف نے اپنے ناول حبس میں یہ بتایا ہے کہ فلسطین پر ہونے والے ظلم و ستم کے پیچھے مغربی استعماریت کا ہاتھ ہے۔ مغربی استعماریت یعنی امریکہ اور برطانیہ نے مل کر یہودیوں کو فلسطین پر اپنا تسلط قائم کرنے کی اجازت دی ہے، اور یہ یہودی اپنے (ہولوکاسٹ) کا بدلہ مغربی استعماریت سے لینے کے بجائے مسلمان فلسطینیوں سے لے رہے ہیں۔ یہودی ترک سکونت (ہولوکاسٹ) اس تحریک کو کہا جاتا ہے جس میں نازی حکومت کی جانب سے کیے جانے والے ظلم و تشدد سے تقریباً چھ ملین یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔۔ انسائیکلوپیڈیا نے ہولوکاسٹ کی تعریف یوں کی ہے:

ہولوکاسٹ ایک منظم سرکاری سرپرستی میں ہونے والا ظلم اور قتل عام تھا۔ جس میں نازی حکومت اور اس کے اتحادیوں اور حلیفوں کی جانب سے چھ ملین یہودیوں کو ہلاک کیا گیا ۔ ہولوکاسٹ ایک ارتقائی عمل تھا جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان پورے یورپ میں واقع ہوا۔ [۱۶]

شناخت کا بحران ہی تارکین وطن میں ایسی صورت حال کو پیدا کرتا ہے کہ وہ ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دیارِ غیر میں رہتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ :

تارکین وطن جب ترک وطن کر جاتے ہیں تو انہیں بیرون ممالک میں اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین، اپنی روایات و اقدار سے دوری کا احساس اور اپنے عزیز و اقارب سے بچھڑ جانے کا غم ستانے لگتا ہے یوں ان کا ذہن شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے آبائی وطن کی سرزمین، وہاں گزارے ہوئے اپنے بچپن، ارد گرد کے ماحول اور حالات و واقعات کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ پھر چاہے تارکین وطن کے اپنے ملک میں گزارے ہوئے پل اچھے ہوں یا برے وہ انہیں بیرون ملک اپنی یادوں کا حصہ بنائے رکھتے ہیں جو ناسٹلجیائی رویے کو جنم دیتا ہے۔

ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کے گزرے ہوئے حالات و واقعات کو یاد کرتے ہوئے ان میں کھو جانا یا پھر اپنے ماضی میں واپس سے جانے اور جینے کی خواہش کرنا ہے اور یہی ناسٹلجیائی رویہ تارکین وطن میں اس وقت زیادہ دیکھنے میں آتا ہے جب تارکین وطن کو بیرون ملک اپنی زمین سے دوری، اپنی تہذیب و ثقافت، اقدار اور روایات یاد آنے لگتے ہیں ۔ تارکین وطن جب بیرون ملک کی زمین میں خود کو ادھورا، تنہا اور اجنبی محسوس کرتے ہیں تو پھر وہ اپنے ملک میں گزارے ہوئے واقعات کو یاد کر کے وہ احساس حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انھیں بیرون ملک میسر نہیں ہوتا ہے۔

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش جب ترک وطن کرتے ہوئے امریکہ جابستا ہے تو نئی سر زمیں اور نئے ماحول میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اکیلے پن کا احساس احمد بخش پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ شدید گھٹن کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ جلد ہی اسے اپنی زمین سے دوری کا احساس ستانے لگتا ہے اور وہ تمام چیزیں یعنی گلیاں، محلوں، بازار اور وہاں کے رہنے والے افراد جو اُسے کبھی اپنے ملک میں ناپسند تھے ایک دم سے یاد آنے لگتے ہیں:

> امریکا آنے کے بعد شروع کے دنوں میں اسے اپنے چھوڑے ہوئے ملک کی ہر چیز کی یاد تنگ کر تی تھی۔ گلی کوچے تک جن میں کیچڑ تیرا کرتی تھی اور خوانچے والے جن کی کھلی ہوئی چیزوں پر گرد اور مکھیاں بیٹھی رہتی تھیں۔ اور جن سے وہ کبھی خرید کر نہیں کھاتا تھا۔ تعجب ہے اب اُسے نہ ان چیزوں سے نفرت محسوس ہوتی تھی نہ گھن۔ امریکا کا کوئی اخبار ہاتھ میں لینے کو اس کا جی نہیں چاہتا

> تھا۔ اپنے یہاں کے اخباروں کے سیاسی مضامین کو پڑھنے کو اس کا جی ترستا تھا۔ واپس لوٹ جانے کا خیال جب اسے پہلی بار آیا تو پورے جسم میں ایک سناٹا سا محسوس ہوا۔ [17]

وطن کی یاد کا سامنا انھیں ہی کرنا پڑتا ہے جنہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا ہو۔ پھر اپنے وطن کو چھوڑنے کی وجہ تارکین وطن کے ہاں کچھ بھی رہی ہوں۔ یہ مرحلہ ہمیشہ سے تارکین وطن کے لئے مشکل ہی رہا ہے۔ ترک سکونت اختیار کرنے والے نہ صرف دوران سفر سختیوں، مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ انہیں بیرون ملک جا کر وحشت بھرے وہ حالات و واقعات یاد آنے لگتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے ۔ اپنے ملک، زمین اور لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے ملک آباد ہو جانا، تارکین وطن کے لیے آسان نہیں ہوتا ہے۔

حسن منظر کے ناول ماں بیٹی میں کلیرس اُس سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور ہوتی ہے جو اس کے آباؤاجداد کی تھی۔ جہاں اس نے اپنا بچپن گزرا تھا، پھر وہی شادی کے بعد کی زندگی بسر کی۔ لیکن کلیرس کے بیوہ ہو جانے کے بعد حالات اور سماج کے لوگ کلیرس کو اس قدر تنگ اور مجبور کرتے ہیں وہ اپنی سرزمین کو چھوڑ دیتی ہے۔ بیرون ملک سکونت اختیار کر لینے کے باوجود کلیرس کا کردار اس جگہ، گلی، محلے اور وہاں کے واقعات کو یاد کرتا دکھائی دیتا ہے ، جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی کی زندگی بسر کی تھی۔ اپنے علاقے، عزیز و اقارب کو یاد کرتے ہوئے کلیرس اپنی بیٹی جیور جیانا سے کہتی ہے کہ:

> ایک نئی سوسائٹی کو اپنانا اس صورت میں کہ کسی کی سوسائٹی نے اُسے ٹھکرا دیا ہو، بڑا تکلیف دہ تجربہ ہے جو سالوں جاری رہتا ہے۔ پچھلے اچھے برے لوگ، پچھلی جگہیں، واقعات خواب میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں اور میں تو اس شہر میں بچپن سے رہ رہی تھی، جسے چھوڑ آئی تھی بلکہ جسے مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ تم بچی تھیں، آکر آسانی سے اسکول کی بغیہ میں لگ گئیں۔ لیکن میں غموں کے بوجھ سے جھک جاتی۔ [18]

غیر میں رہتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والے ناسٹلجیائی رویے کی صورتحال ہمیں حسن منظر کے ناول حبس میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول کی کہانی کا موضوع منصف نے نازی حکومت کی یہودیوں سے دشمنی، پھر یہودیوں کی فلسطین آمد اور فلسطین کی سرزمین پر قبضے کو بنایا ہے۔ نازی حکومت کا بنیادی مقصد ہی یہود دشمنی تھا اور یہ دشمنی عالمی جنگ عظیم دوم میں اس قدر بڑھ گئی کہ نازی حکومت نے یہودیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک اپناتے ہوئے انہیں اجتماعی طور پر گولیاں مارنے اور گیس سے ہلاک کرنا شروع کر دیا اور خصوصی طور پر یہودیوں کے لیے بنائی گئی قتل گاہوں میں ان کا قتل عام کیا گیا۔ اس ظلم و تشدد اور قتل عام کی وجہ سے تین یورپی یہودیوں میں سے

دو کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور جو یہودی نازی حکومت کے ظلم سے بچ گئے وہ اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے لیکن یہ یہودی لوگ دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے کے باوجود خود کو اور اپنے ذہنوں کو (ہولوکاسٹ) کے واقعات سے آزاد نہیں کر پائے۔ ماضی اور حال کی کشمکش سے پیدا ہونے والے ناسٹلجیائی رویے کا اظہار ناول حبس کے کردار ایرک میں یوں دکھائی دیتا ہے۔ "ہمارا خدا تھا جس نے یوروپ کے کسی بھی ملک میں ہماری حفاظت نہیں کی: روسی حکومت کی ایما پر ۱۹۰۵ء میں کرائے گئے ہمارے قتل عام سے، نہ نازی جرمنی کے ہاتھوں۔ وہ پوگروم تھا"۔[۱۹]

برطانیہ اور دیگر ملکوں نے ایک بار پھر سے یہودیوں کو نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا تو یہودیوں کی ایسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے صلاح الدین نے انہیں فلسطین آ بسنے کی دعوت دی۔ فلسطینیوں نے ان یہودی لوگوں کی خاطر مدارت کی کہ یہ ہٹلر کے ستائے ہوئے ہیں۔ لیکن ۱۸۹۷ء میں ہنگری کے ایک یہودی مفکر تھیوڈور ہرزل نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد فلسطین کی سرزمین کو یہودیوں کی سرزمین قرار دینا تھا اور اس کے لیے یہودیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ وہی سلوک اپنایا جو نازی حکومت نے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ناول حبس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حسن منظر لکھتے ہیں کہ:

> تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یہ درست ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس نیا کچھ دینے کو نہیں ہوتا ہے۔ فلسطین پر قدم جما کر سفید یہود نے پھر وہی راہ اختیار کی جس نے انہیں یورپ میں ناقابل قبول بنا دیا تھا۔ ہمیشہ خود کو یہود اور دوسروں کو gentile غیر یہود سمجھنا، ان دوسروں کی اپنی کوئی پہچان نہیں تھی، تھی تو یہود تعلق سے۔ عرب ان کے لیے خدا کی کوئی گری ہوئی مخلوق تھے جن کا اس زمین سے بے دخل کر دیا جانا ضروری تھا اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے تھا۔[۲۰]

امریکہ اور برطانیہ نے مل کر اسرائیل کو اجازت دے دی کہ زمین کے اس ٹکڑے کو جسے فلسطین کہا جاتا ہے وہ وہاں اپنی ریاست قائم کر سکتے ہیں۔ یوں ۱۹۴۸ میں فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل نے اپنا تسلط قائم کر لیا اور فلسطینیوں کو ان کے ہی ملک سے نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا۔ فلسطینیوں کی آبادیوں کو اجاڑ کر وہاں یہودیوں بستیاں قائم کی جانے لگیں۔ فلسطینی اب بھی اپنی زمین، اپنے ملک کی بقا کے لئے لڑ رہے ہیں۔ انہیں مغربی استعماریت اور اسرائیل والے دہشت گرد قرار دیتے ہوئے مار رہے ہیں۔ ناول حبس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں کہ:

اگرچہ ناول کا بنیادی موضوع بیسویں صدی میں فلسطین کی سرزمین پر ہزاروں سال سے بسنے والے انسانوں کو اس سرزمین سے بزور بے دخل کرنے اور کھیتوں، کھلیانوں اور گھروں اور سکولوں پر ہی نہیں، اس کے باسیوں کے جیتے جاگتے اجسام پر بھی بل ڈوزر چلا کر اپنے شہر تعمیر کرنے کی ڈھٹائی اور انسانیت کے نام نہاد علم برداروں کی اس معاملے میں اسرائیل کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی ہے لیکن در حقیقت یہ تاریخ کے ایک طویل باب کے بازگشت بھی ہے۔ ۔۔۔۔یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اسرائیل شیرون کو، جس نے ہٹلر سے کہیں بڑھ کر مظلوم اور بے یار و مددگار فلسطینی قوم کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا اور حق و ناحق کی تمیز کھو کر گھٹنوں چلتے بچوں تک کو خرگوشوں کی طرح شکار کر کے سب سے بڑا دہشت گرد ہونے کا ثبوت دیا، مغربی دنیا کے جمہوریت اور انسانیت کے نام لیواؤں نے کیسے اپنی سرپرستی اور حمایت سے نواز رکھا تھا؟۔۔۔۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کیوں مغربی دنیا، جو جانوروں تک کے حقوق کے لیے بے چین ہو جاتی ہے، کئی عشروں سے فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر خاموش ہے۔[۲۱]

حسن منظر کے ناول انسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن کا کردار بھی اپنے آبائی علاقے کی یاد میں گم دکھائی دیتا ہے۔ اس کی سوچوں کا دارومدار حال کے بجائے ماضی کی یادوں اور آنے والے دور میں رونما ہونے والے واقعات کے گرد گھومتا ہے۔ ناول میں موجود تلمیذ کا کردار اس سرزمین کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پاتا ہے جہاں اس نے اپنے بچپن گزارا تھا۔ ماں کی تلمیذ الرحمن سے محبت، نینی پور میں گزارے ہوئے لمحات، دوستوں کی جانے والی شرارتیں اور ابا کی ڈانٹ تلمیذ کے کردار کو یاد ماضی میں گھیرے رکھتی ہیں۔ جس کی بدولت تلمیذ الرحمن کا کردار شدت سے ان لمحات کو پھر سے محسوس کرنا چاہتا ہے جن کا تعلق بچپن اور ماضی سے ہے۔ وہ حال کی ناآسودگی اور کرب سے فرار حاصل کرنے کے لیے ماضی کو یاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔

جو گھڑیاں کبھی بھلائی جانے والی نہ تھی۔ ان میں وہ تھیں جو نینی پور کی زندگی کے متعلق تھیں ۔۔۔۔نینی پور کے دن بچپن کے دن تھے جو چاہے کتنے ہی دکھ اور تکلیف سے بھرے ہوں ۔بڑے ہوئے تک کے عمل میں یاد آنے پر خوبصورت بن جاتے ہیں۔ تلمیذ بھی لوگوں کو اپنے روداد سناتے ہوئے جس کا وہ ہمیشہ شیدا رہا۔ ہنس ہنس کر بتاتا کیسے شرارتوں پر ابا سے پٹتا تھا۔۔۔۔ان میں بہت سے واقعات ایسے تھے جن کا بیان کرتے ہوئے اس کی آواز رندھ جاتی تھی۔ مثلاً گھر سے ایک طرح سے نکالے جانے پر اس کا راستے بھر رونا۔[۲۲]

ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والا ناسٹلجیائی رویہ حسن منظر کے ناول انسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن کے کردار میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں موجود یہ کردار جب راجدھانی پہنچتا ہے تو وہ نینی پور میں گزرے اپنے وقت اور حالات کے بارے میں سوچتا ہوا ماضی میں کھو جاتا ہے۔ نینی پور کی یادیں پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے میں موجود ہوتیں ہیں۔ وہ راجدھانی کی گلیوں، محلوں کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں نینی پور کی گلیاں اور محلے گردش کرنے لگتے ہیں۔ یوں تلمیذ کا کردار راجدھانی اور نینی پور کی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش میں گم دکھائی دیتا ہے۔

ترک سکونت اختیار کرنے والے جب کسی دوسرے ملک سکونت اختیار کرتے ہیں تو انہیں بے پناہ مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نئے وطن پہنچ کر بھی انہیں سکون و آرام نصیب نہیں ہوتا ہے۔ تارکین وطن اپنے ذہن میں اپنے بچھڑے ہوؤں کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش میں زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیرون ملک رہتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والے ناسٹلجیائی رویے کی یہی کیفیت ہمیں حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کے کردار میں بھی دکھائی دیتی ہے، جب وہ اپنے ملک اور امریکا کی دکانوں کا موازنہ کرتے ہوئے ماضی اور حال کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

> یہاں کے ڈپارٹمنٹل اسٹور اور اپنے یہاں کی دکانوں میں کتنا فرق ہے۔ یہاں ہر چیز کو ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے کہ اسٹور والے کہیں گے تم چیزوں کو پولیوٹ کر رہے ہو۔ اپنے یہاں ایک جامن اٹھاؤ۔ چکھو، پسند آئے۔ خریدو نہیں تو اگلے ٹھیلے کی طرف بڑھ جاؤ۔ کوئی نہیں کہے گا، تمہارے ہاتھ دھلے ہوئے نہیں ہیں۔[۲۳]

یہ یاد ماضی یعنی وطن کی یاد تارکین وطن میں بیرون ملک رہتے ہوئے تھوڑے وقت کے لیے سکون کا لمحہ بن جاتا ہے۔ جہاں وہ تنہائی، ویرانی، مایوسی اور ناامیدی جیسے خیالات سے فرار حاصل کر سکتے ہیں۔ تارکین وطن میں اپنے وطن کی یاد کا یہی سلسلہ ہمیں حسن منظر کے ناول بیرشیبا کی لڑکی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں ربیکا کی کہانی کا دائرہ کار بھی وطن کی یاد کے گرد ہی گھومتا ہے۔ ناول میں ربیکا کا کردار اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے راوی سے انہی گلیوں محلوں اور جگہوں کا ذکر کرتا ہے جہاں اس نے اپنے والدین کو آخری بار دیکھا تھا۔ یوں ربیکا کا کردار نازی حکومت کے ظلم و ستم کی وجہ سے کی جانے والی دوسرے ملک نقل مکانی، دوران سفر پیش آنے والے مصائب اور اپنے والدین کو کھو دینے والے حالات و واقعات کو یاد کرتے ہوئے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ ربیکا اپنے احباب کے

ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کو مختلف انداز میں مختلف طریقوں سے یاد کرتی رہتی ہے۔ ناول میں ربیکا اپنے ملک اور اپنے ماں باپ سے بچھڑ جانے والے واقعے کو یاد کرتے ہوئے اپنے دوست داؤد سے کہتی ہے کہ:

۱۹۳۹ کی بات ہے۔ اب مجھے یاد نہیں ہے ہم کیسے ائرپورٹ پر پہنچے تھے۔ مگر وہاں وہ شوہر اور بیوی، میں اور میرے ماں باپ ایک بینچ پر بیٹھا دیئے گئے تھے۔ لوگ آرہے تھے اور جا رہے تھے ، مگر ہم سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی کوئی سولجر اپنا سواستکا جمائے، بندوق سنبھالے اپنے آگے آگے کسی بدنصیب روتی ہوئی یہودی عورت کو لے جا رہا ہوتا تھا۔ کبھی کسی نوجوان یہودی لڑکے کو۔ ان کو دیکھ کر میری ماں بھی اپنا چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں خشک کر لیتی تھی۔ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، ہمیں معلوم نہیں تھا۔ میں اُس وقت تک بڑی نہیں ہوئی تھی بس اتنا مجھے یاد ہے۔[۴۴]

مصنف نے اپنے ناول بیر شیبا کی لڑکی میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ ناول میں ربیکا کا کردار حال میں رہتے ہوئے اپنے ماضی سے جڑا رہتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار ربیکا کی ملاقات اسرائیل میں داؤد سے ہوتی ہے اور پھر کہانی دونوں کرداروں کے ماضی، حال اور تعلقات کو بیان کرتی چلی جاتی ہے۔ اس ناول کے حوالے سے آصف فرخی لکھتے ہیں۔

ربیکا کی کہانی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم پہلے اس کے عمل اور رویے دیکھتے ہیں پھر اس کی ابتلاء کے ایک حصے سے واقف ہوتے ہیں یوں وہ ہمارے سامنے آہستہ آہستہ ابھرتی ہے۔ جس طرح کہانی کا بیان کار اسے دریافت کرتا جاتا ہے۔ مصنف نے کردار کے ماضی کو اس کے عمل کے جواز کی خاطر یا اس کی سیدھی سادی توجیہہ فراہم کرنے کی غرض سے استعمال کیا بلکہ ماضی اس کی زندگی کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے والی قوت (بلکہ شاید واحد طاقت) کے طور پر سامنے لایا ہے اور یوں اس کے وجودی مرکز میں عمل پیرا ہوتا ہے۔[۴۵]

دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اپنے ملک واپس لوٹ جانے کی امید رکھنا:

دیگر ممالک میں سکونت اختیار کرنے والے تارکین وطن جہاں اپنے ذہنوں میں وطن کی یادوں، وہاں گزارے ہوئے اپنی زندگی کے لمحات اور واقعات کو بھولا نہیں پاتے ہیں، وہی وہ اپنے وطن واپس جانے کی امید بھی دل میں رکھ کر بیرون ممالک میں اپنی زندگی گزار کر رہے ہوتے ہیں۔ تارکین وطن بیرون ملک یہ سوچ کر اپنی زندگی بسر رہے ہوتے ہیں کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے آبائی وطن ضرور جائیں گے۔ اس لیے بھی تارکین وطن

میزبان ممالک میں اجنبیت کی زندگی جی رہے ہوتے ہیں اور خود کو نئے ملک کے ماحول کے مطابق ڈھالنے نہیں دیتے ہیں۔ بیرون ملک رہنے والے تارکین وطن جب بیرون ملک اپنے ہم وطنوں سے ملتے ہیں تو ان کے دل میں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ بیرون ملک رہنے والے ان کے ہم وطن بھی واپس اپنے ملک لوٹ جائیں۔

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کو امریکا میں رہتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ گھٹن کی زندگی جی رہا ہے، یہ بھی کوئی زندگی ہے جہاں سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف مشین کی زندگی گزار رہے ہیں، ایک مصنوعی زندگی۔ وہاں کے ماحول سے احمد بخش کو وحشت ہونے لگتی ہے، تب احمد بخش سوچتا ہے کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس اپنے گاؤں دھنی بخش لوٹ جائے گا اور وہ اپنے دل میں یہ خواہش بھی رکھتا ہے کہ امریکا رہنے والے اس کے ہم وطنوں کو بھی واپس اپنے آبائی گھر چلے جانا چاہیئے۔ ناول میں احمد بخش کے اپنے وطن واپس جانے کی خواہش اظہار یوں ملتا ہے۔

> اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کا ہر باشندہ جس سے وہ ملتا تھا۔ اس کی اس بات پر متفق ہو کہ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ اور اگر کوئی کہتا وہ یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ ان لوگوں کے ووٹ جمع کر رہا ہے جو یہاں رہنے پر تیار نہیں ہیں۔ واپس جائیں گے اور یوں وہ بھی بغیر احساس ملامت کے اس ملک سے جہاں سڑکیں سونے چاندی کی بنی ہیں اور گھروں کی دیواروں میں لوگوں نے ہیرے اور لعل جڑ رکھے ہیں واپس جا سکے گا، کہہ سکے گا' وہاں کوئی معقول آدمی رہ ہی نہیں سکتا ہے۔ میں کیسے رہتا۔ اس پلا ٹینم کے بدیس سے اپنا گلٹ کا دیس بہتر ہے۔"[۲۶]

العاصفہ میں زید کا کردار اپنے گھریلو زندگی کے مسائل سے تنگ، ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے گھر سے فرار حاصل کر کے دوسرے ملک ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے "ک" چلا جاتا ہے اور وہاں وہ "ج" آئل کمپنی میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے آزادی حاصل کر کے زید کچھ عرصے بے فکری اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد اُسے بھی بیرون ملک اپنی زمین سے دوری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ زید کے کردار بھی ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والے ناسٹلجیائی رویے کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اپنی زمین سے دوری اور وطن کی یاد زید کو اس وقت زیادہ محسوس ہوتی ہے جب اسے اپنے والدین کا خط ملتا ہے۔ جس میں اسے واپس گھر لوٹ آنے کے لیے اور شادی کے بارے میں لکھا ہوتا ہے:

اس نے مجھے لکھا تمھاری عمر شادی کرنے کی ہے۔ اس لیے مفنی مامفنی لوٹنے کی سوچو، لیکن بہتر یہ ہو گا کہ پہلے شادی کی ہامی بھر لو۔۔۔۔۔خط پڑھ کر لمحے بھر کو گھر کی یاد نے میرے دل کو جیسے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔ جلدی سے تلے اوپر تین چار شادیاں کر ڈالنے کی خواہش ہمارے یہاں لڑکے دل میں لے کر جوان ہوتے ہیں۔ تین چار کے خیال سے دور سہی لیکن ایک شادی کے ارادے سے میں کبھی دور نہیں تھا۔[۲۷]

ناول العاصفہ میں زید کا کردار اپنے معاشرے کی برائیوں، کج رویوں، سیاسی و سماجی تلخیوں سے دل برداشتہ ہو کر ترک سکونت اختیار کرنے کا ادارہ کرتا ہے۔ حسن منظر نے ناول العاصفہ میں دراصل ایسے ممالک کے لوگوں کو زیر موضوع بنایا جو اپنے معاشرے میں موجود برائیوں، مظالم، منافقت پر مبنی سماج، طبقاتی تقسیم اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے اُس نظام کو قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ناول العاصفہ میں زید کا کردار عرب معاشرے کے لوگوں میں انہی برائیوں، ظلم اور استحصال کو دیکھتے ہوئے خاموش رہنے کی وجہ سے ذہنی الجھن کا شکار ہے۔ناول العاصفہ کے حوالے سے اجمل کمال لکھتے ہیں کہ:

ناول میں پیش آنے والے واقعات ایک بے نام عرب ملک میں پیش آتے ہیں۔ اور اس ملک کے شہروں کو بھی محض ان کے ناموں کے ابتدائی حروف "ک" یا "ن" سے شناخت کیا گیا ہے ۔ اگرچہ ناول میں بہت سے اشارے موجود ہیں جن کی مدد سے اس ملک کو پہچانا جا سکتا ہے۔ لیکن نام نہ دے کر حسن منظر نے اپنے ناول کو متعدد ایسے ملکوں کا استعارہ بنا دیا ہے جہاں سیاسی جبر اور منافقانہ مذہبیت کا تسلط ہے۔ اس جبر اور منافقت کے ہاتھوں ان معاشروں میں رہنے والوں کی روحیں کس طرح مسخ ہوتی چلی جاتی ہیں اور زندگی کی امنگ کیوں کر ان کے جسموں سے نچوڑلی جاتی ہیں اس کا گہرا احساس "العاصفہ" کے کرداروں نوجوان زید اور اس کی بہن کی زندگیوں کے نشیب و فراز میں سمو دیا گیا ہے۔[۲۸]

ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا اپنے آبائی وطن کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی ہے۔ ماضی کی یادوں سے جوڑے واقعات ربیکا کو اس حد تک بے چین کئے رکھتے ہیں کہ وہ اس ملک جانا چاہتی ہے جہاں اس کے آباؤ اجداد کی جڑیں پیوست ہیں۔ اسے ہر لمحہ ہر وقت اپنے آبائی وطن کی یاد، وہاں گزارے ہوئے اپنے حالات وواقعات یاد آتے رہتے ہیں۔ اپنے وطن واپس جانے کی خواہش ربیکا کے کردار میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ربیکا اپنے وطن

اسرائیل واپس جانا چاہتی ہے لیکن داؤد اسرائیل کے کرب ناک واقعات اور حادثات کو یاد کرتے ہوئے چاہتا ہے کہ ربیکا اسرائیل سکونت اختیار نہ کرے۔ جس کا اظہار ناول میں یوں ملتا ہے۔

> میری اندر کی آنکھوں میں ایک کے بعد ایک یروشلم کے ماضی کے خیال آئے۔۔۔۔اس کے پیغمبروں پر ظلم کے اور موجودہ دور میں اس کے چاروں طرف کی زمین پر مسمار کئے جاتے ہوئے لوگوں کے مکانوں اور ان کے سکولوں اور ہسپتالوں کی عمارتوں کے۔۔۔۔ جیسے میرا حافظہ ایک ریموٹ کنٹرول کا سوئچ دبا کر اپنے پروجیکٹر سے میرے ذہن کی اسکرین پر یروشلم کے ماضی کی تصویریں ایک کے بعد ایک لا رہا تھا۔۔۔۔ حضرت ذکریا کا اپنی جان سے جانا اور حضرت یحیٰی کا اپنا سر کھونا۔ یہ آج کی عمارتیں کتنے دن کھڑی رہے گی؟ میں سہم کر رہ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "ریب تم یہاں سکونت مت اختیار کرنا"۔ اس نے پوچھا "کیوں؟" میں نے کہا۔ اس شہر کا ماضی دردناک ہے اور اس کے مستقبل کی پیش گوئی کچھ اچھی نہیں ہے۔[۲۹]

نقل مکانی کرنے والے افراد اپنے ساتھ کچھ خواب، آرزوئیں اور امیدیں لے کر دوسرے ممالک میں سکونت اختیار کرتے ہیں اور جب تارکین وطن کے یہی خواب، آرزوئیں اور امیدیں پوری نہیں ہوتیں ہیں تو وہ دلبرداشتہ ہو کر واپس اپنے وطن لوٹ جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بیرون ممالک میں رہنے والے لوگوں کے سرد رویے ہی تارکین وطن میں اجنبیت، بے بسی اور بے نوائی جیسے احساسات کو اجاگر کرتے ہیں۔ اپنے آبائی وطن واپس جانے کی خواہش کا اظہار ہمیں حسن منظر کے ناول ببیر شیبا کی لڑکی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جب داؤد اپنی زندگی کے مسائل سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ داؤد چاہتا ہے کہ وہ اور اس کے بیوی بچے اپنے آبائی وطن واپس چلے جائیں اور وہاں اپنی باقی کی زندگی بسر کریں لیکن داؤد کے بیوی اور بچے واپس اپنے ملک جانے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اپنے وطن واپس جانے کے بارے میں داؤد ربیکا سے کہتا ہے کہ:

> کتنی بار میں یہ فیصلہ کرتے کرتے رہ گیا تھا کہ برطانیہ کو خدا حافظ کہوں، جس کا میں شہری تھا جس کے وسائل سکڑتے چلے جا رہے تھے اور جہاں مجھے اپنی کھال کی وجہ سے بار ہا بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ یہ بھی کہ آسٹریلیا اور کینیڈا میں جا بسنے کا ارادہ میں نے کئی بار کیا تھا مگر ان دو ملکوں میں جو ملکہ عالیہ کے سایہ عاطفت میں تھے مجھے مناسب پوسٹ نہیں ملی اور اپنے اجداد کے ملک کو لوٹنے پر نہ بیوی تیار تھی نہ بچے۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی میرا کنبہ برطانیہ کی شفقت سے عاری بانہوں میں تھا۔[۳۰]

ناول انسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن بھی داخلی کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔نیئی پور سے راجدھانی کی جانے والی ترک سکونت اس کے کردار میں دیگر ذہنی الجھنوں اور مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔ وہ اپنے باپ اور بہن بہنوئی سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی زندگی میں مگن ہو جاتا ہے۔ لیکن ناول میں موجود تلمیذ کا کردار اپنی ماں سے ملنے، اپنے گھر واپس جانے اور اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار اپنی ماں سے بے حد دلی لگاؤ رکھتا ہے کیوں کہ اس کی ماں اس کی حساس طبیعت کو جانتے ہوئے اس کا خیال رکھتی ہے۔اس کے نزدیک ماں کی محبت کا کوئی النعم البدل نہیں ہے۔وہ اپنی ماں سے چھٹیوں میں ملنے جانے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ ماں سے ملنے جانے کا اظہار تلمیذ الرحمن یوں کرتا ہے۔

> چھٹیوں میں جب تلمیذ گھر جانے لگتا تو بھانجوں بھانجیوں سے کہہ کر جاتا تھا۔اپنی ماں کے گھر جارہا ہوں، دیکھ لینا وہاں سے موٹا اور طاقت ور ہو کر آؤں گا۔ تمہیں بھی طاقت ور بننا ہے تو چھٹیاں گزارنے نانا کے گھر جایا کر۔ وہاں تمہیں اصلی کھانا ملے گا۔۔۔یہاں کیا ہیں سوکھی روٹیاں! ۔۔۔حقیقت بھی یہی تھی جتنے دن وہ نیئی پور میں رہتا تھا کھانا زور وشور سے پکتا تھا کہ بیٹا گھر آیا ہے ۔اس معاملے میں تلمیذ کے باپ کی مرضی نہیں چلتی تھی۔[۳۲]

تارکین وطن میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا سبب تنہائی، اداسی، مایوسی، کرب، خوف:

بیرون ملک رہنے والے تارکین وطن نئے ملک اور نئے ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ بیرون ملک رہتے ہوئے ایک دوسرے سے ناشناسائی تارکین وطن میں اس قدر شدت اختیار کرتی ہے کہ وہ تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔وہ ایسے ماحول سے بھاگ جانا چاہتے ہیں جہاں ان کا کوئی دوست، کوئی ہم راز موجود ہی نہیں ہے جن سے وہ اپنے دل کی باتیں کر سکیں اور اپنی تنہائی کو دور کر سکیں۔یوں دیار غیر میں رہنے والے تارکین وطن اداسی، مایوسی، تنہائی اور بے بسی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا کردار تنہائی کا شکار دکھائی دیتا ہے جب وہ امریکا میں رہ رہا ہوتا ہے تو اسے وہاں کے ماحول سے اجنبیت اور بیگانگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔بیرون ملک کے ماحول سے احمد بخش میں بے چینی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی اس بے چینی اور تنہائی سے فرار حاصل کرنے کے لیے انجانے لوگوں سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بیرون ملک رہنے والا ہر شخص اپنے کاموں میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔یوں احمد بخش کو امریکا کی زندگی سے وحشت ہونے لگتی ہے اپنی اسی وحشت اور تنہائی کو دور کرنے کے لیے وہ فطرت سے

دوستی کر لیتا ہے اور جب کبھی احمد بخش کو لگتا ہے کہ اسے یہاں نوکری کر لینی چاہئے تو اُسے پھر سے تنہائی کا احساس ستانے لگتا ہے:

> کبھی کبھی یہ خیال بھی آنے لگا تھا یہاں کچھ عرصے کی نوکری بری نہیں ہو گی، لیکن تنہائی؟ اور اس خیال کے آتے ہی اس کی بے چینی بڑھ جاتی تھی۔ انھی دنوں جب وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا اور جس کا اثر ایک بار پھر پڑھائی اور اس سے متعلق ملنے والے کام پر پڑ رہا تھا اسے ایک پاکستانی دکان میں اپنی طرف کے ایک بزرگ نظر آئے انہوں نے ہی احمد بخش سے بات کرنے میں پہل کی اور دونوں میں تھوڑی دیر وہیں کھڑے کھڑے بات چیت ہوئی۔ اتنی دیر میں وہ احمد بخش کی تنہائی کو تاڑ گئے اور بولے، "ابھی تازہ آئے ہیں؟"
>
> "جی"
>
> "تنہا ہیں"؟
>
> "جی"۔
>
> "بیوی بچے ساتھ نہیں ہیں؟"
>
> "کوئی نہیں۔ نہ یہاں نہ وہاں۔"[۴۲]

بیرون ملک احمد بخش تنہائی کا شکار ہے۔ اسے بیرون ملک کوئی بھی دوست، ہمدرد میسر نہیں ہے جس سے وہ اپنی تنہائی کو کم کر سکے۔ امریکا میں احمد بخش اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ دوسری ہی ملاقات میں ڈاکٹر احمد بخش کی تنہائی کو بھانپ لیتا ہے۔ ناول میں احمد بخش کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر احمد بخش کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ بیرون ملک شادی کر لے جو اس کی تنہائی اور مایوسی کو ختم کر سکتی ہے:

> ایک دن اس نے احمد بخش کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر کہا "یہ ملک تنہا رہنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ ہزار اندیشے ہیں۔" باہر برف پڑی تھی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ احمد بخش کو لگا اس کے اندر تنہائی ڈاکٹر کے ان دو جملوں سے بڑھ گئی ہے۔ "اپنے یہاں سے کسی کو لے آؤ ورنہ یہیں کسی کو لے کر مسجد میں پہنچ جاؤ۔ ایک بوتل شیمپین کی اجر تیر میں ملا کے سامنے تمہارے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔"[۴۳]

بیرون ملک شادی کر لینے کے باوجود احمد بخش خود کو امریکا میں تنہا پاتا ہے۔ اسے ہر وقت یہ وسوسے ستاتے رہتے ہیں کہ اگر کبھی مجھے میری بیوی چھوڑ کر اپنے آبائی وطن چلی گئی تو میرا کیا ہو گا۔ کیا تنہائی پھر سے میرا مقدر رہے گی اور میں اس جذبات سے عاری ملک میں اکیلا رہوں گا۔ یوں بیرون ملک میں رہتے ہوئے احمد بخش کا کردار مسلسل

ذہنی اذیت اور کش مکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ بیرون ملک میں رہتے ہوئے احمد بخش بے چارگی، بے بیک وقت خوف اور دہشت کی کیفیات سے دوچار نظر آتا ہے اور وہ انہی کیفیات میں مبتلا ہو کر اپنی ذات سے خود کلامی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ:

> ہو سکتا ہے وہ سوئیڈن واپس لوٹ جائے جیسی اسکینڈی نیوین کہانیوں کا پلاٹ وہ تمہیں سناتی رہی ہے، اور تم چاہے اس کے ساتھ سوئیڈن جاؤ یا یہیں رہو تنہائی تمہارا مقدر ہو گی۔ نہ عبدالرحمن تمھاری نماز جنازہ پڑھانے آئے گا نہ اس کا کوئی بیٹا۔ اور قبر پر اگر بتیاں کون جلایا کرے گا، کون عید، بقر عید اور بارہ ربیع الاول کو اس پر گلاب کی پنکھڑیاں ڈالا کرے گا۔ سوچو، سوچو گہرائی تک بات کی تھاہ میں اترو۔، یہ وہ بات تھی جو احمد بخش نے اولا کو کبھی نہیں کہی تھی کہ صرف بچوں کے بڑے ہو کر یہاں کے رنگ میں رنگ جانا ہی سب کچھ نہیں ہے جس کی وجہ سے میں یہ ملک چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ میں تنہائی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔"[۳۴]

اداسی ماضی سے جنم لیتی ہے جب انسان اپنے ماضی میں بیتے ہوئے لمحات کے بارے سوچتا ہے تو وہ اداس، مایوس اور افسردہ ہو جاتا ہے۔ تارکین وطن کے ہاں بھی اداسی کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے جب وہ بیرون ملک میں رہتے ہوئے اپنے آبائی وطن، روایات، اقدار اور عزیز و اقارب کو یاد کرتے ہیں تو وہ اداس ہو جاتے ہیں یوں تارکین وطن کا دل بیرون ممالک میں رہتے ہوئے بھی مایوس، پریشان اور اداس رہتا ہے بلکہ انہیں بیرون ملک کا پورا ماحول ہی اداسی کا منظر پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کو اپنے ملک کی یاد اداس کرتی رہتی ہے اور وہ وہاں رہنے کو اس کا جی نہیں چاہتا ہے۔ اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی نظام سے تنگ آکر وہ ترک سکونت اختیار کر لیتا ہے لیکن پھر بھی اسے بیرون ملک اپنے وطن سے جدائی کا احساس متاتار ہتا ہے اور بیرون ملک کے ویرانے سے اسے اپنے ملک کے حالات اور وہاں گزارے گئے پل یاد آتے ہیں تو وہ اداس، پریشان اور افسردہ ہو جاتا ہے:

> رات کو جب جب پاس لیٹے ہوئے اولا نے اس سے سوال کیا۔ 'کیا سوچ رہے ہو'؟ تو اس کا جواب ہوتا تھا۔ 'اپنے ملک کے بارے میں سوچ رہا ہوں جسے چھوڑ آیا ہوں، جسے بدلا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں اور جو نہیں بدلے گا۔"[۳۵]

تارکین وطن ترک وطن کرتے ہوئے جب مصیبتوں، مشکلات اور مصائب کو جھیل کر ایک نئے وطن میں آباد ہونے لگتے ہیں تو وہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ یہاں پر اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکیں گے لیکن تارکین وطن کا ذہن

نفسیاتی طور پر اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود خود کو اور اپنے ذہن کو دوران سفر کی تلخیوں سے الگ نہیں کر پاتے ہیں۔

حبس کا مرکزی کردار ایرک جو اسرائیل کا وزیر اعظم تھا۔ دماغی شریان پھٹنے کی وجہ سے وہ کوما میں ہے لیکن اس کا ذہن فلسطین کی جبری طور پر کی جانے والی نقل مکانی کے بارے میں سوچتا دکھائی دیتا ہے کہ کس طرح اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مل کر ظلم و تشدد اور قتل و غارت کرتے ہوئے بے گناہ فلسطینیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی سر زمین کو چھوڑ دیں۔ ناول حبس میں ایرک کا کردار بھی ماضی اور حال کی کشمکش سے جنم لینے والے ناسٹلجیائی رویے کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ فالج اور کوما میں ہونے کے باوجود ایرک ہسپتال کے عملے کی گفتگو کو نہ صرف سن سکتا ہے بلکہ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔ وہ صابرہ اور شتیلہ سمیت ان تمام کیمپوں کا قصاب اور اپنے دماغ میں آنے والے واقعات کو یاد کرنے سے روک نہیں پاتا ہے۔ ماضی اور حال کی کشمکش ہی ایرک کو ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی اسے ان دردناک اور اذیت بھرے لمحات سے آزادی دلا دے اور جب کبھی ناول میں ایرک کا دماغ تھوڑا سکون چاہتا ہے تو مختلف قسم کی آوازیں اس کے ذہن کو پھر سے کرب میں مبتلا کر جاتیں ہیں۔ یوں ایرک کا کردار ہر لمحہ ہر پل اذیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

> پھر وہ بے ہنگم آوازوں (discord) کا اور کیسٹرا شروع ہو جاتا ہے جسے میں سننا نہیں چاہتا ہوں ۔ایک آواز دوسری سے میری برائی کر رہی ہے۔ کوئی میرے خیالات کو اونچی آواز میں دہرا رہا ہے۔ ان آوازوں کو ہاسپٹل اسٹاف نہیں سن سکتا ہے۔ کبھی میرے ہاتھوں یا میرے حکم پر ماری جانے والی عرب عورتوں کے لمبے بال میرے چہرے کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی بے ربط موویز کے ٹکڑے مجھے سامنے کی دیوار پر دکھائے جاتے ہیں جنہیں میں دیکھنا نہیں چاہتا پر دیکھنا پڑتا ہے اور تعجب اس امر پر ہے کہ اس مووی پر نہ کسی ڈوکٹر کی نظر پڑتی ہے نہ نرس کی۔۔۔۔۔۔ میں ان سب سے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ اس نمائش کو بند کرو۔ کاش سمجھ سکو میں کس کرب میں مبتلا ہوں۔ ان کے نزدیک ای۔ ای۔ جی موت نہیں دکھا رہا ہے لیکن میں ہر اعتبار سے مر چکا ہوں۔ مرا جا رہا ہوں۔ [۳۶]

ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کا کردار ہر وقت اپنے آبائی وطن کی یاد میں اور نازی حکومت کی وجہ سے کی جانے والی لوگوں کی جبری نقل و حرکت کے بارے میں سوچتا دکھائی دیتا ہے۔ ربیکا دیگر ممالک میں سکونت اختیار کر لینے کے باوجود کسی بھی وطن سے محبت اور لگاؤ محسوس نہیں کر پاتی ہے۔ ناول میں ربیکا کا کردار مسلسل اداسی

اور مایوسی کا شکار دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ وہ بیرون ملک رہتے ہوئے بھی اسرائیل میں ہونے والے بھیانک واردات کو یاد کر کے کرب میں مبتلا ہے۔ اسے بارہا اپنے والدین سے بچھڑ جانے اور ہم وطنوں کا دیگر ممالک میں دربدر کی زندگی گزارنے کا خیال اداس، پریشان اور غمگین کر دیتا ہے۔

> وہ پتہ نہیں بڑبڑا رہی تھی یا مجھ سے مخاطب تھی۔"میرے ماں باپ نے میری زندگی بچانے کے لیے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور گیسٹاپو کے انہیں لے جاتے وقت انہوں نے اپنے دلوں پر جبر کیا ہو گا کہ مجھے پلیٹ کر نہ دیکھیں۔ آخری بار کا دیکھنا کتنا جذبات سے پُر ہوتا ہے، کتنا اہم، ورنہ اس کی خلش دل میں رہ جاتی ہے۔ لوگ جاتی ٹرین سے سر باہر نکال نکال کر اور دروازے سے لٹک لٹک کر پیچھے رہ جانے والے کو دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہی دور پھر آ جائے تو مجھے شک ہے کہ میں خود کو ڈیوڈ پر ایک آخری نظر ڈالنے سے روک نہیں سکوں گی۔ میری محبت خود غرضی کی ہے کہ وہ مجھے خوشی دینے کے لیے دنیا میں آیا۔ میری زندگی کی تنہائی دور کرنے۔"[۳۷]

حسن منظر نے ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کی ذہنی ناآسودگی اور بے چینی کو بیان کیا ہے، جو ترک سکونت کے تجربے سے گزرنے، ایک نئی زندگی ملنے اور ایک نئے وطن میں آباد ہو جانے کے باوجود ذہنی سکون سے محروم ہے۔ ربیکا اپنے ذہنی انتشار، کرب، مایوسی اور ناآسودگی کو بیان کرتے ہوئے داؤد سے کہتی ہے کہ:

> نازی گرفت سے بچ نکلنے کے بعد میرا ایک ہی طرز زندگی ہونا چاہئے تھا، خاموشی اور سکون سے رہنا، ہر قسم کے خرخشے سے دوری۔ لیکن میں نے ایک بار پھر خود کو دن رات کی جنگ میں پھنسالیا ہے۔ میرا خیال ہے میں احمق ہوں۔[۳۸]

نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار حسن منظر کے ناول العاصفہ کے کردار زید میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے جو گھریلو زندگی کے مسائل، گھر کی ذمہ داری اٹھانے کا بوجھ، اور انسانی رشتوں (خواہ وہ اپنے والدین، بہن، بھائی کا ہی کیوں نہ ہو) میں بے اعتمادی اور بے یقینی کی کیفیتوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ ناول العاصفہ میں زید اپنے باپ کی طرز زندگی اور اس کے نشہ کرنے کی وجہ سے کمسنی کی عمر میں مختلف ملازمتیں اختیار کرتے ہوئے گھر کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیوں کہ گھر کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ گھر کی ذمہ داری اٹھانے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار زید یوں کرتا ہے۔

اٹھارہ سال کی عمر تک میری آمدنی مستقل رہی اور اس کی (باپ) گاہے گاہے۔ اس لیے ماں، باپ ہمیشہ سے میری کمائی سے مطمئن اور مجھ سے ناخوش رہے جس طرح کھاد کی بو سب کو ناگوار ہوتی ہے اور اس سے جو غلہ اُگتا ہے سب کو بھاتا ہے۔ میں وہ کھاد ہوں۔ اندر تک بدبودار۔[۳۹]

ناول میں زید کا کردار اپنے باپ کی خود غرضی، لاپروائی، جھوٹ بولنے، دغا دینے، شراب پینے، نشہ آور اشیاء بیچنے اور عورتوں کا دلال ہونے کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتا رہتا ہے۔ زید چاہتا ہے کہ اس کا باپ ایک ذمہ دار شخص بنے لیکن اس کے باپ کو بس اپنی زندگی سے مطلب ہے باقی اسے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے۔ اپنی انہی ضروریات و آسائش کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی بیٹیوں تک کو فروخت کر سکتا ہے۔ ناول العاصفہ میں زید اپنے باپ کی انہی حرکات و سکنات کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

میں سوچتا تھا اور دھواں دماغ کو چڑھتا تھا۔ میرا باپ دھوکے باز ہے۔ جھوٹا ہے مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا تھا میرے اندر کا زید پکارتا تھا گف گف (قف قف) اور میں برا بھلا کہتے کہتے رک جاتا تھا۔[۴۰]

گھریلو ذمہ داری، لڑائی جھگڑوں اور باپ کے شرابی ہونے کی وجہ سے زید بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد گھر کی یاد آنے پر وہ بیرون ملک سے کچھ پیسے منی آرڈر کر دیتا ہے۔ باپ کو جب زید کی اچھی آمدنی کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے منیرہ سے شادی کا خواب دکھا کر پیسے لوٹنے لگتا ہے اور ان پیسوں کو اپنے نشہ کرنے کے لیے خرچ کر دیتا ہے۔ زید کو کہیں نہ کہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس کا باپ اسے ٹھگ رہا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے باپ پر ایک بار پھر سے اعتماد کرتے ہوئے اپنی تمام جمع پونجی باپ کو بھیج دیتا ہے اور کچھ عرصے بعد واپس اپنے گھر آ جاتا ہے۔ گھر کی وہی خراب حالات، باپ کے پھر سے جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے اور منیرہ کی گھر میں ناموجودگی زید کو اپنے باپ سے مزید نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ناول العاصفہ میں رشتوں میں بے اعتمادی اور بے یقینی کی یہی کیفیت زید کے کردار میں فرسٹریشن کو ظاہر کرتی ہے۔ مہرونہ لغاری ناول العاصفہ میں زید کے کردار کا تجزیہ کرتے لکھتی ہیں کہ:

ناول میں زید اور اس کے باپ کے درمیان مسلسل کشمکش چلتی رہتی ہے۔ حسن منظر نے زید کے کردار کی تشکیل میں خصوصی طور پر توجہ صرف کی ہے۔ زید باپ کے رویوں کی وجہ سے باپ سے نفرت کرتا ہے اور ماں سے اس کی مرعوبیت شامل ہے۔ زید اپنے ماحول سے شاکی ہے فرسٹریشن کا شکار ہے۔ اپنے اردگرد موجود معاشرے کی روش سے، گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے بیزار ہے

مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ کردار جب ماں سے محبت کا دم بھرتا ہے اور باپ کا ذکر حقارت سے کرتا ہے تو فرسٹریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔[۴۱]

ناول العاصفہ میں زید کا کردار انہی مسائل کی وجہ سے کرب، دہشت اور بے چینی کا شکار ہے۔ اسے اپنے گھر میں سکون کا کوئی لمحہ میسر نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ گھر میں زید کی سوتیلی بہن اور ماں کے جھگڑے ہیں جو ہر وقت محلے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کئے رکھتے ہیں۔ یوں زید گھر کے اندر اور گھر سے باہر ایک مسلسل اذیت سے بھری زندگی بسر کرنے پر مجبور دکھائی دیتا ہے۔ ناول سے اقتباس

> میرے سامنے نیم تاریک کمرے کے دروازے پر لوءلوء کھڑی رو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں اور میں اُسے دیکھ دیکھ کر ڈر رہا ہوں کہ کب دورہ پڑے گا۔ میرے سامنے صحن میں ماں بیٹھی رو رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے گھر کے آس پاس بہت سی عورتیں ان دونوں کے الھانے اور ننگی باتیں کان لگائے سن رہی ہیں اور باہر نکلتے ہی مجھے لوگوں کی باتیں سننی پڑیں گی۔ صرف مجھے ہی کیوں؟ میرا قصور محض اتنا ہے کہ اس بے ربط، بے رشتہ، اور بے جوڑ کنبے میں میں وہ واحد سانس لینے والی مشین ہوں کہ جیسے احساس کی تکلیف عطا ہوئی ہے۔ میں کیوں ان دونوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے نفرت نہیں کر سکتا! اگر ایسا ہوتا تو لاکھوں بے حس انسانوں کی طرح آج میں بھی خوش ہوتا۔[۴۲]

ناول العاصفہ میں لوءلوء کا کردار بھی ذہنی و نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے۔ لوءلوء زید کی سوتیلی بہن ہے، گھر کی بڑی لڑکی ہونے کی وجہ سے گھر کی ذمہ داری، ہر نئے آنے والے بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش بھی لوءلوء کے ذمے ہے۔ لوءلوء گھر کے گھٹن زدہ ماحول اور سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے تنگ ہے۔ گھریلو تشدد اور ناسازگار حالات کی وجہ سے لوءلوء ذہنی کشمکش شکار ہے۔ ناول میں لوءلوء اپنے فرسٹریشن کا اظہار اشعار کہہ کر کرتی ہے اور جب سوتیلی ماں سے جھگڑا مار پیٹ کی صورت اختیار کرتا ہے تو لوءلوء کی حالت بگڑنے لگتی ہے۔

> ہمیشہ کی طرح باپ ڈرے ہوئے چوہے کی طرح ادھر ادھر دبکتا پھرا اور بالآخر لوءلوء کو ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس دن میں نے لوءلوء کو گرم ہوتے دیکھا جس طرح لوہا تپائے جانے پر آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگتا ہے۔ اس نے اپنے اشعار پڑھنے شروع کیے جو مغروروں کو شرم دلانے کے لیے لکھے گئے تھے۔ ماں پر بھوت سوار ہو گیا اور اس نے کتاب چھین کر باہر اچھال دی۔ لوءلوء کے ہاتھ پیر اینٹھنے لگے اور منہ سے جھاگ ابل آیا۔ پھر وہ کھڑے قد سے زمین پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔[۴۳]

ناول میں لوءلوء کا کردار مسلسل کرب اور داخلی بے چینی سے عبارت ہے ،جو اس کے کردار میں ایک مسلسل اضطرابی کیفیت کو بیان کرتا ہے اور یہ اضطرابی کیفیت لوءلوء میں گھر کے ناساز گار حالات اور سوتیلی ماں کے سلوک کی وجہ سے ہے۔ گھر کے حالات سے تنگ آکر لوءلوء ایک دن گھر سے بھاگ جاتی ہے۔

زید معاشرے میں موجود برائیوں، بدلتے حالات، سیاسی منافقانہ نظام اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ ناول میں زید کا کردار ان تضادات کو ناپسند کرتا ہے جو معاشرے میں موجود لوگوں کے لیے تفریق کا سبب بنتے ہیں۔ معاشرے میں موجود یہی تضادات زید کے کردار میں بے چینی، گھٹن، ذہنی کشمکش اور نفسیاتی مسائل کی صورت میں رونما ہو کر اس کی زندگی میں جذباتی خلا کو اجاگر کرتے ہیں۔ حسن منظر کے ناول العاصفہ کے بارے میں مسکین منصور لکھتے ہیں کہ:

> یہ ناول آج کی کمپلیکس زندگی کی عکاسی کرتا ہے جس میں قدریں بھی بدل رہی ہیں اور انسان بھی ۔ جس میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر سامنے لایا جارہا ہے۔ دنیا میں ایک ظالمانہ نظام قائم ہو چکا ہے۔ جس میں خاص طور پر کمزور اور عام طور پر طاقتور ملک بھی بے یقینی کا شکار ہیں۔ سکون کہیں نہیں۔ بڑی اور چھوٹی طاقتیں غریب ملکوں کے ریسورسز کے ساتھ ساتھ ان کے حکمرانوں اور عوام کا بھی استحصال کر رہے ہیں۔ "[۳۴]

گھریلو مسائل کی زندگی، بے یقینی، بد اعتمادی، زندگی کے تلخ تجربات اور گھر کے وحشت زدہ ماحول سے تنگ آکر زید فرار کی راہ چننا چاہتا ہے۔ وہ اپنے گھٹن زدہ ماحول سے دل برداشتہ اور ذہنی ناآسودگی کی وجہ سے ترک سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ جس کا ذکر زید اپنے دوست محمد سے یوں کرتا دکھائی دیتا ہے کہ:

> اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میں نے یہ جملہ کہا اور خود مجھے تعجب ہوا کہ بغیر کسی سوچ بچار کے میں فیصلہ کر چکا تھا۔ پھر محمد نے مجھ سے پوچھا، 'اور تمہاری بہن کہاں جائے گی'؟ "معلوم نہیں" "عجیب بھائی ہو۔ اسے چھوڑ دو گے!" "اور کیا کر سکتا ہوں"، میں نے ہارے ہوئے انسان کی طرح کہا۔ میں بھی جینا چاہتا ہوں۔ اوروں کے لیے اپنی جان نہیں دے سکتا۔ مجھے معلوم تھا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ جس آدمی کا دل دھڑکتے دھڑکتے تھک چکا ہو، اسے کہنا چاہیے تھا 'میں جینے سے عاجز آ چکا ہوں، میں تازہ ٹھنڈی ہوا کا بھوکا تھا اور چاہتا تھا ہر دم توڑتی ہوئی ہستی کی طرح اس دنیا سے جو کچھ مجھے آخری لمحے میں مل سکتا ہے ملنا چاہیے،۔۔۔۔۔ آرام، سکون، پانی، اور ہوا۔[۳۵]

اپنے وطن سے دوری کا احساس بے اطمینانی کی کیفیت کو جنم دیتا ہے جس کی وجہ تارکین وطن کو بیرون ملک میں رہتے ہوئے تنہائی کا احساس، کرب، خوف، اور ذہنی دباؤ کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ تارکین وطن دیار غیر میں رہتے ہوئے بھی اجنبیت اور بیگانگی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ حسن منظر کے ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کا کردار نازی حکومت کے قتل و غارت اور ظلم و ستم کی وجہ سے خوف، کرب اور ذہنی دباؤ جیسے تجربوں سے گزر کر ہالینڈ آباد ہو جاتا ہے۔ ناول میں ربیکا کے ذہن میں اسرائیل کی مایوسی اور غم کی گھٹا چھائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان خیالات، خوف اور دہشت کے ماحول کے فرار چاہتی ہے۔

میں خود سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب ان ڈپریشن میں لے جانے والے خیالات کو نہیں آنے دوں گی لیکن وہ فلسطینیوں کی طرح میری بے خبری میں حملہ کر جاتے ہیں۔ کب تک میں اپنے دماغ پر پہرہ دے سکتی ہوں۔[۲۶]

حسن منظر کے ناول العاصفہ میں زید کا کردار اپنے معاشرے کے منفی اور متصادم رویوں کی وجہ سے ذہنی کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے اس بے حس معاشرے سے فرار چاہتا ہے اور ایک نئے ماحول نئی زندگی کا طلبگار ہے جہاں اسے اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا اور ذہنی سکون مل سکے۔ گھریلو حالات کی تنگی، سماجی اور معاشی مسائل سے تنگ آکر زید ترک سکونت اختیار تو کر لیتا ہے لیکن ترک وطن کر لینے کے باوجود زید خود کو اس زندگی سے الگ نہیں کر پایا جو وہ جی رہا تھا۔ زید ج میں رہتے ہوئے خود کو دنیا کی فکروں سے آزاد محسوس کرتا ہے لیکن در حقیقت وہ اپنے اکیلے پن اور اندر کے خالی پن کی وجہ سے داخلی کرب اور بے چینی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ اسی کشمکش میں زید ایک دن خود کو پوسٹ آفس کے سامنے کھڑا پاتا ہے۔

میری ہاتھ میں بیس دینار کی منی آرڈر رسید تھی اور میں کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر کے جو اذیت آج تک مجھے ملی تھی۔ اس میں میرے دل نے روحانی سکون پایا تھا۔ آج منی آرڈر بھیج کر میں نے ایک بار پھر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا اور زندگی پھر میرے لیے وہی بے مزہ وہم بن گئی تھی۔[۲۷]

ناول انسان، اے انسان میں بھی تلمیذ الرحمن کا کردار ذہنی کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ راجد ھانی میں تلمیذ کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک اس کے کردار میں نفسیاتی الجھنوں کا سبب بنتا ہے۔ بڑی آپا اور بہنوئی کا لیا دیا رویہ، مار پیٹ، کھانے کے لیے صرف دو بسکٹ دینا، اس کے کردار میں رشتوں سے تنگ دلی، اعتنائی اور بے یقینی کی صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں۔

تلمیذ کے والد کا با قاعدہ ہر ماہ تلمیذ کے لیے بڑی آپا کو رقم بھجواتے رہنا۔ اس سب کے باوجود تلمیذ کے ساتھ بڑی آپا اور بہنوئی کا برتاؤ اسے احساس محرومی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اپنی ایسی زندگی، ماحول اور بھوک سے تنگ آکر تلمیذ کا کردار جوئے سے پیسے کمانا شروع کر دیتا ہے۔ بعد ازاں اس کا کردار ذہنی کرب اور بے چینی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے اسے یہ احساس گناہ ستانے لگتا ہے کہ جب میں نینی پور میں تھا تو مجھے کبھی کھانے کے لیے جوئے سے پیسے نہیں کمانے پڑے۔ ناول میں تلمیذ الرحمن کا کردار احساس گناہ میں مبتلا ہو کر خود سے ہی سوال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> راجدھانی میں جیسے بھی تھے، دن گزرتے جا رہے تھے جب وہ وقت آیا۔ جب اس خیال نے تلمیذ کو اپنی گرفت میں لے لیا کہ 'میں اچھا انسان نہیں ہوں۔ کیا تھا، کیا بن گیا ہوں، کیا بنتا جا رہا ہوں۔ میرے ارادے میرے بس میں نہیں ہیں۔ میرے اندر جو شیطان ہے، جسے میں سب سے چھپاتا ہوں۔۔۔۔ میں گھر سے جو جسم لے کر آیا تھا وہ ابا کی حلال کی کمائی سے بنا تھا۔ لیکن جیتا وہ جسم اب ہے کیا اس کے لیے میں کہہ سکتا ہوں حلال کی کمائی سے بنا ہے؟ تم جواری ہو، دماغ جواب دیتا۔[۴۸]

والدین اور اپنے آبائی گھر سے دوری ہی تلمیذ کے کردار میں داخلی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا باعث بنتی ہیں۔ اور اس کے کردار کو حلال و حرام کے تصور سے غافل کر دیتی ہیں۔ وہ جوئے اور شراب نوشی جیسی بری عادات کو اپنا لیتا ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد بہن اور بہنوئی کا تلمیذ کو گھر سے نکال باہر کرنا، اسے طوائفوں اور فلم کیپٹل سٹی لے جاتا ہے۔ جہاں وہ محنت کے بجائے جرائم پیشہ کاموں میں ملوث ہو کر پیسہ کماتا ہے۔ یہاں ناول میں تلمیذ کے کردار کا اخلاقی حوالے سے دیوالیہ نکل چکا ہے۔ تلمیذ کا کردار داخل اور خارج کی کشاکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اسے ستانے لگتا ہے کہ وہ گناہوں کے کاموں میں ملوث ہے۔ ایسی کیفیات تلمیذ الرحمن کو اندر ہی اندر خوف، تنہائی اور مایوسی کا شکار بن دیتیں ہیں، جو تلمیذ کے کردار میں کشمکش اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے۔

ناول بیر شیبا کی لڑکی میں داؤد کا کردار بھی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ وہ بیرون ملک رہتے ہوئے بے چینی اور ذہنی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں داؤد کا کردار اپنے ذہنی سکون کے لیے ایک ایسے ملک کا انتخاب کرتا ہے جہاں پہلے سے ہی دہشت اور خوف کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ داؤد اسرائیل اس لیے جانا چاہتا ہے کہ وہاں کی دہشت اور خوف ناک فضا اس کے اعصاب کو کچھ عرصے کے لیے سن کر دے اور وہ وہاں وہ سکون محسوس کر سکے جو اسے برطانیہ میں نصیب نہیں ہوا۔

> محبت کی شادی کا ٹوٹنا یا اس میں ٹوٹنے کی نوبت آ جانا بڑا مہلک سودا ہوتا ہے۔ میں نزع کی سی کیفیت میں تھا۔ سکون کے لیے وہاں جانے کی میری اپنی دلیلیں تھیں۔ ان میں سے ایک تو وہی تھی جو اوپر بیان کر آیا ہوں کہ جو دہشت اور کشاکش وہاں کی فضا میں تھی۔ وہ شاید میرے اعصاب کو سن کر دی گی۔۔۔۔۔اسرائیل کے شدید خوف کی فضا میں چند دن کے لیے اپنے ذہن اور اعصاب کے ماؤف ہو جانے کی توقع لے کر میں وہاں گیا تھا کیونکہ تمام ہپنو ٹکس (hypnotics) مجھ پر بے اثر ہو چکے تھے۔[۴۹]

ناول میں داؤد کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت اپنی محبت کی شادی ٹوٹنے کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے اور دوسری وجہ وہ اپنے بیوی اور بچوں کو واپس اپنے وطن لوٹ جانے کے لیے منا نہیں پاتا ہے۔یوں داؤد کا کردار ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اسرائیل کے حالات دیکھتے ہوئے اس کی بیوی اسے وہاں جانے سے روکے بھی اور وہ ذہنی سکون کے لیے وہاں جائے بھی۔

> برطانیہ سے اسرائیل کے لیے روانہ ہوتے وقت مجھے ایک توقع یہ بھی تھی کہ میری بیوی مجھے ایسی جگہ جانے سے روکے گی جہاں ہر لمحے جنگی ہوائی جہاز ہوا میں بلند ہوتے اور لینڈ کرتے ہیں اور جس کے کسی نہ کسی کوچے میں آئے دن بم پھٹتے رہتے ہیں۔اُسے سنانے کے لیے میں نے اپنے سفر کے ارادے کا ذکر بچوں سے کئی بار کیا مگر اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔جتنی گہری وہ محبت تھی جو ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک لائی تھی اس نے اتنی ہی گہری لاتعلقی ہم میں پیدا کر دی تھی۔[۵۰]

حسن منظر نے اپنے دو مختصر ناولوں بیر شیبا کی لڑکی اور ماں بیٹی میں کرداروں کے ذریعے سے اُن افراد کی داخلی کیفیات کو سماجی رویوں کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے جو معاشرے کی بے رحم حقیقتوں کی وجہ سے اخلاقی اور ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان ناولوں میں حسن منظر نے ان افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کیا ہے جو معاشرے کے رویوں کی وجہ سے اضطراب، کرب، بے چینی اور خوف کی زندگی گزر رہے ہوتے ہیں۔ان دونوں ناولوں میں مصنف نے ایک چیز کو مشترک رکھا ہے اور وہ مشترک شے ان دونوں ناولوں کے نسائی مرکزی کردار ہیں۔ آصف فرخی ان دونوں ناولوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> اپنے مختلف زمان و مکان اور بیانیے میں راوی کے نقطہ نظر میں تکنیکی فرق کے علاوہ ان دونوں ناولوں میں ایک اور چیز مشترک ہے، قریب قریب یکساں طوالت کے یہ ناول اپنے مرکزی نسوانی کردار کے گرد گھومتی ہوئی کہانیاں ہیں بلکہ ماں بیٹی میں مرکزی کردار دو ہیں جن کی کہانیاں

آپس میں گتھ گئی ہیں۔ ایسے نسائی کردار جن کے المیے ان کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتے ہیں ۔رنگ و نسل و مذہب کی سرحدیں پار کر جاتے ہیں۔ اور جن کی ابتلا میں شخصی و انفرادی خرابی کے ساتھ رفتار عالم بھی کارفرما نظر آتی ہے، کہ وہ اپنی زندگیوں میں دنیا کی بے انصاف، لاپرواہ اور کسی کے جذبات و احساسات کو خاطر میں نہ لانے والی روش کو جھیلتی اور سہتی بلکہ جی کر گزارتی ہیں ۔[۵۱]

اسی طرح ناول ماں بیٹی میں کلیرس کے شوہر کے مر جانے بعد سماج کے لوگ ہی کلیرس اور اس کی بیٹی جیور جیانا کے لیے عدم تحفظ کا سبب بنتے ہیں۔ معاشرے میں تنہا عورت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فتحیاب جیسے کئی مرد کلیرس کا فائدہ اٹھانے کو ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ایسے حالات کے پیش نظر کلیرس خود کو اور اپنی بیٹی جیور جیانا کو گھر میں قید کر لیتی ہے۔ انہی سماجی رویوں کی وجہ سے کلیرس کا کردار ذہنی انتشار، خوف اور کرب میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔

کلیرس نے گھر سے نکلنا چند دن بند رکھا اور جیور جیانا کو بھی کھڑکی پر سے باہر دیکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ایک میں انھیں تیزاب پھینکے جانے کا خطرہ، دوسرے گولی کا۔ اس کے بعد چند دن ٹیلی فون کالز آئیں جن کے لئے نہ وہ اٹھتی تھی، نہ جیور جیانا کو اجازت تھی کہ جاکر ہیلو تک کرے۔ پھر ٹیلی فون کٹ گیا اور بل آنا شروع ہو گئے اور مما ڈرتی تھیں کہ ایک دن بجلی، پانی اور گیس سے بھی محروم کر دیے جائیں گے۔۔۔۔۔ گھر میں کوئی گروسری اسٹور تو تھا نہیں کہ ہم مہینے دو مہینے جی لیتے۔ آخر کار انہوں نے اندھیرا ہونے پر نیچے جانا شروع کیا۔ تیزی سے جاتی تھی اور چند ہی منٹ بعد کچھ نہ کچھ لیے لوٹ آتی تھیں۔ وہ کچھ نہ کچھ لوف اوف بریڈ بھی ہو سکتی تھی، چند گاجریں بھی۔۔۔۔ لیکن ہم ماں بیٹی اس سے بھی گئی گزری غذا پر زندہ تھے۔ ان دنوں مجھے اکثر احساس ہوتا تھا کہ ہمارا دنیا میں کوئی بھی تو نہیں تھا۔[۵۲]

ناول ماں بیٹی میں بے حس معاشرے اور خراب ازدواجی زندگی کا کلیرس کے ساتھ سلوک اُسے اس قدر خوفزدہ کر دیتا ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ جو کچھ اس پر بیتا اور جو کچھ اس نے برداشت کیا ہے۔ اس کی بیٹی جیور جیانا کو بھی کرنا پڑے اس لیے کلیرس کا کردار ناول میں اپنی بیٹی کے ہاؤس وائف بننے سے خوف زدہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ خوف، دہشت اور کرب ناک خیالات کلیرس کے شعور اور لاشعور کا حصہ بنے ہوئے ہیں جو کلیرس کے کردار میں داخلی کرب، خوف اور ذہنی انتشار کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایک دن جب وہ زیادہ ہی پریشان تھیں جیور جیانا نے ازرہ ہمدردی کہا تھا۔ مما! آپ کہیں تو میں اسکول چھوڑ دوں۔ "پھر کیا بنو گی؟" ہاؤس وائف۔"" خدا نہ کرے۔ "کلیرس نے گھبرا کر کہا

۔۔۔۔۔۔ کیوں نہیں مما؟اس لیے کہ عورت کے لیے سب سے بڑا پیشہ ہاؤس وائف ہونے کا ہے
بلکہ وائف ہونے کا۔ آپ ہاؤس وائف نہیں ہیں؟کلیرس خاموش رہی۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو
اوپر کے دانتوں سے چبارہی تھی۔ [۵۳]

ناول ماں بیٹی میں جیور جیانا کا کردار بھی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہے۔ وہ بچپن سے ہی زندگی کے تلخ تجربات، ماں باپ کے جھگڑے، باپ کا ایک دن انھیں چھوڑ جانا، گھر کے تنگ حالات اور افلاس کو دیکھتے ہوئے جوان ہوتی ہے۔ ماں کو تنہا کمانے کے لیے تگ ودو کرتے ہوئے جیور جیانا کبھی بھی کلیرس سے کوئی فرمائش نہیں کر پاتی کیونکہ اسے گھر کے تمام حالات کا علم ہوتا ہے۔ "جیور جیانا ماں کے پاس گئی اور دیر تک پیچھے ان کے کندھے پر ٹھوڑی ٹیکے کھڑی رہی جیسے ضرورت پڑنے پر وہ ماں کے سہایتا کو فوراً موجود ہو۔" [۵۴] ناول ماں بیٹی میں مصنف نے حمزہ اور فتحیاب جیسے کردار کے ذریعے سے معاشرے میں موجود ان مردوں کی نمائندگی کی ہے جو عورت کو بے بس، تنہا اور مجبور سمجھ کر ان کا فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ڈرا دھمکا کے تو کبھی جنسی اور جسمانی تشدد کے ذریعے سے۔ حسن منظر نے اپنے ناول ماں بیٹی میں ان کرداروں کے رویوں کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معاشرے میں ایک تنہا عورت کا زندگی بسر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ جیسے کہ فتحیاب کا کلیرس کی زندگی میں اس کی پنشن کی مدد کے لئے آنا، کہ وہ بظاہر ایک نیک نیتی کے لیے بیوہ کی مدد کر رہا ہے لیکن درپردہ وہ کلیرس کے جسم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مہرونہ لغاری فتحیاب کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

اس سے ڈاکٹر فتحیاب جیسا عیاش انسان ٹکراتا ہے جو اسے حمزہ کی بیوہ کی طور پر پنشن اور دیگر
واجبات ملانے میں اس کی مدد کا یقین دلاتا ہے لیکن درپردہ وہ اس کے مالی حالات سے واقفیت کے
بعد مالی مدد کر کے جسم تک رسائی آسان بنالیتا ہے۔ [۵۵]

کلیرس کا کردار معاشرے کے ان ہی رویوں، موجود برائیوں اور لوگوں کی خراب ذہنیت سے خود کو محفوظ نہیں کر پاتا۔ وہ اپنی بیٹی اور اپنی زندگی کی بقا کے لئے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فتحیاب جیسے مرد کا ساتھ قبول کر لیتی ہے۔ فتحیاب کا ساتھ قبول کر لینے سے کلیرس کا کردار اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار دکھائی دیتا ہے ۔معاشرے کے یہی رویے کلیرس کی بیٹی جیور جیانا کے ذہن پر اتنا اثر کرتے ہیں کہ وہ معاشرے کے ہر مرد سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ حسن منظر نے ناول ماں بیٹی میں سماجی ناہمواریوں اور بے رحم حقیقتوں کے ذریعے سے بتایا ہے کہ سماجی رویے صرف کلیرس کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کی بیٹی جیور جیانا کے ذہنی نفسیات کو بھی متاثر کرتے ہیں

۔جیور جیانا اپنی ماں کی زندگی کو دیکھتے ہوئے اضطراب اور بے اطمینانی میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔جیور جیانا کے کردار میں یہ اضطرابی کیفیت اور بے اطمینانی والد کے نہ ہونے اور بے حس معاشرے کی وجہ سے ہے۔یوں ناول میں جیور جیانا کا کردار داخلی بے چینی اور اضطراب کا عکاس ہے۔

> پھر ایک خیال دماغ میں آکر لگا چلا گیا، آئندہ نہ وہ کسی سے باتیں کریں اور اسے گھر لائیں نہ میں بڑی ہو جانے پر کسی مرد سے بات کروں گی۔.I hate them all, I hate them اس کے بعد کے دن ایسے تھے جیسے ماں بیٹی کو زندان میں ڈال دیا گیا ہو۔وہاں روشنی آتی تھی اور ہوا چلتی تھی ورنہ یہ جگہ کسی تاریک زیرزمین قید خانے (dungeon) سے کم نہیں تھی۔[۵۶]

ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کا کردار ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار دکھائی دیتا ہے ۔ترک وطن کی وجہ سے ربیکا کا کردار تشخص کے بحران، اکیلے پن، اضطراب، بے اطمینانی، ذہنی انتشار اور کرب میں مبتلا ہے۔بیرون ملک کے ماحول میں ربیکا خود کو نامکمل، ادھورا اور اپنی ذات میں ایک خلا کو محسوس کرتی رہتی ہے ۔اپنے اسی خلا کو پُر کرنے اور ادھورے پن کو ختم کرنے کے لیے وہ ڈاکٹر ایڈ ایمی سے ناجائز تعلقات قائم کرتی ہے۔ ربیکا ڈاکٹر ایڈ ایمی سے محبت اور توجہ کی طلبگار ہے۔ناول میں ربیکا کے امید سے ہونے، ڈاکٹر ایڈ ایمی کے دھوکے اور چھوڑ جانے کی وجہ سے وہ احساس کمتری، احساس گناہ اور عدم توجہی کا شکار ہو جاتی ہے۔اپنے کم مائیگی کا احساس پورے ناول میں ربیکا کے کردار پر حاوی رہتا ہے۔وہ اپنے انہی احساسات کی وجہ سے ذہنی دباؤ اور کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ربیکا اپنی ذہنی کشمکش اور اذیت کا ذکر کرتے ہوئے داؤد سے کہتی ہے کہ:

> کب تک؟ کب تک اعصاب خود کو ایک دفاعی جنگ کی ابدی تیاری میں رکھ سکتے ہیں، جھیل سکتے ہیں کہ نہ معلوم کس لمحے جنگ چھڑ جائے۔میری زندگی ایک مصنوعی زندگی ہے۔میں خود پر تعجب کرتی ہوں۔ایک بہت پرانا گناہ اور اپنے کمزور اعصاب سے میں ابھی تک ایک بے معنی جھوڑ میں لگی ہوں۔۔۔۔جس عذاب سے وہ گزر رہی تھی وہ دغا کا احساس تھا جسے اس نے اپنے ذہن میں وہ گناہ بنا رکھا تھا جو انسان کی تمام گراوٹوں کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔جو بات میں نے اس سے کہی تھی یہ تھی "ربیکا میں تمہاری اس بے معنی جھوڑ کر سمجھ رہا ہوں۔کاش ڈاکٹر ایڈے یمی بھی تمہارے ساتھ اس جھوڑ میں مبتلا ہوتا یا تمہیں پتہ چلے وہ بھی دماغ کی اس خانہ جنگی میں مصروف ہے"میری بات سن کر وہ اس طرح چونکی جیسے کھلے ہوئے آسمان کے تلے کوئی سو رہا ہو اور بارش کے پہلے چھینٹوں سے جاگ اٹھے۔[۵۷]

حسن منظر نے اپنے ناولوں کے ذریعے سے ان افراد کی ذہنی ونفسیاتی اور معاشرتی مسائل کو بیان کیا جو اپنے مرکز سے یعنی وطن سے ہٹ کر کسی دوسرے ملک میں آباد ہوئے اور اپنے وطن سے دوری ہی ان افراد کی زندگی میں بے چینی واضطراب اور انتشار کا باعث بنی۔ ان کے ناولوں میں موجود کردار معاشرتی ناہمواریوں، عدم تحفظ کا شکار اور کم حیثیتی کی وجہ سے خود اذیتی میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

حسن منظر کا مطالعہ اور مشاہدہ خاصا وسیع اور متنوع ہے۔ وہ کسی بھی ملک یا معاشرے کے سیاسی و سماجی مسائل کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ سماجی و سیاسی اور معاشرتی حالات کا نہ صرف مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اپنے تحریروں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتتے بھی ہیں۔ مصنف اپنی تحریروں میں معاشرے کے تلخ حقائق، سیاسی و سماجی مسائل، یا پھر دیگر معاملات کو یوں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس منظر یا واقعے کو اپنے سامنے چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ حسن منظر کے ناولوں میں بارہا ایسے مناظر اور واقعات کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر باریک بینی سے اپنے اردگرد کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ نبی احمد، اردو شاعری میں ہجرت پی ایچ ڈی اردو، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۷۔

۲۔ وزیر آغا، ہجرت انشائیہ (کراچی: تخلیقی ادب عصری مطبوعات، ۱۹۸۰ء)، ص ۳۴۲۔

۳۔ https://www.verywellmind.com/identity-versus-confusion-2795735/

تاریخ ملاحظہ: ۱۰ جنوری، ۲۰۲۲۔

۴۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے (کراچی: شہرزاد پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۷۰۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۸۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۳۰۵۔

۷۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔

۹۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۱۰۔ آصف فرخی، "اجنبی سرزمینوں سے"، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد نمبر ۱۹، شمارہ (مئی، جون ۲۰۱۰ء)، ص نمبر ۴۳۔

۱۱۔ حسن منظر، دو مختصر ناول (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۶۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۱۳۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر کی ادبی خدمات (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۱۱۔

۱۴۔ حسن منظر، العاصفہ (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۰۶ء)، ص ۳۶۔

۱۵۔ حسن منظر، انسان، اے انسان (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۹۔

۱۶۔ https://encyclopedia.ushmm.org/content/ur/article/introduction-to-the-holocaust/ تاریخ ملاحظہ: ۲۸ فروری، ۲۰۲۲۔

۱۷۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۹۵۔

۱۸۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص ۱۴۰۔

۱۹۔ حسن منظر، حبس (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۷۱۔

۲۰۔ حسن منظر، "انسانیت کا تابوت"، مشمولہ ماہنامہ چہار سو جلد ۱۹، شمارہ (مئی جون، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۳۔

۔۲۰۲۲

۲۱۔۔https://daanish.pk/49401 / تاریخ ملاحظہ: ۲۸ فروری، ۲۰۲۲۔

۲۲۔ حسن منظر، انسان، اے انسان (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۵۔

۲۳۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۹۶۔

۲۴۔ منظر، حسن۔ دو مختصر ناول، ص ۳۵۔

۲۵۔ آصف فرخی، "حسن منظر کے دو مختصر ناول" مشمولہ کہانی گھر کتابی سلسلہ ۴/ ۳ مرتب زاہد حسن (اپریل / ستمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۱۴۱۔۱۴۲۔

۲۶۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۹۷۔

۲۷۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص ۵۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۲۹۔ حسن منظر، العاصفہ (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۰۶ء)، ص ۳۷

۳۰۔ اجمل کمال، حسن منظر کا العاصفہ و دیگر نیا ادب، ویب سائٹ BBC Urdu.com، وقت اشاعت بدھ، ۲۲ اگست ۲۰۰۷ء، PST19:۵۳

۳۱۔ حسن منظر، انسان، اے انسان (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۳ء)، ص ۶۳۔

۳۲۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۲۹۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۰۱۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۹۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۸۰۔

۳۶۔ حسن منظر، حبس (کراچی: شہزاد پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۰۔

۳۷۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص ۵۳۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۳ تا ۶۴۔

۳۹۔ منظر، حسن۔ العاصفہ، ص۱۰۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۴۱۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر کی ادبی خدمات، ص۱۴۸۔۱۴۹۔

۴۲۔ حسن منظر، العاصفہ، ص۲۴تا۲۵۔

۴۳۔ ایضاً، ص۱۲۔

۴۴۔ مسکین احمد منصور، "اشکوں میں رعنائی"، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد۱۹، شمارہ (مئی جون، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۶۔

۴۵۔ حسن منظر، العاصفہ، ص۲۹۔

۴۶۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص۵۴۔

۴۷۔ حسن منظر، العاصفہ، ص۳۲۔

۴۸۔ حسن منظر، انسان، اے انسان، ص۵۵۔

۴۹۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص۸۔

۵۰۔ ایضاً، ص۹۔

۵۱۔ آصف فرخی، "حسن منظر کے دو مختصر ناول" مشمولہ کہانی گھر کتابی سلسلہ ۴/۳ مرتب زاہد حسن، اپریل / ستمبر ۲۰۱۲ء، ص، ۱۴۴۔

۵۲۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص۱۳۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص۸۴۔

۵۴۔ ایضاً، ص۸۵۔

۵۵۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر کی ادبی خدمات، ص۲۲۷۔

۵۶۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص۹۵۔

۵۷۔ ایضاً، ص۶۳۔

باب سوم:

حسن منظر کے ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی مسائل کا مطالعہ

باب سوم:

حسن منظر کے ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی مسائل کا مطالعہ

انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور اس اعزاز کی وجہ انسان کے پاس عقل اور شعور کا موجود ہونا ہے کیونکہ یہی وہ شے ہے جو انسان کو جانوروں اور حیوانوں سے ممتاز بناتی ہے۔ اسی عقل اور شعور کی بدولت ہی ارتقائی مراحل میں انسان نے اپنے جینے، کھانے پینے اور آلات و اوزار بنانے کے طریقے جانوروں اور پرندوں سے سیکھے ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدا میں انسان نے پرندوں کے غاروں میں رہنے اور گھونسلے بنانے کے طریقے اور اپنے رہنے کے لیے آشیانہ (گھر) بنانا سیکھا۔ ارتقائی دور میں انسان پتوں کے ذریعے سے جسم کو ڈھانپتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ انسان نے اپنے شعور اور ذہنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے کپڑے بنانے سیکھے۔ مرنے کے بعد انسان کو دفنانے کا طریقہ بھی انسان نے کوے سے سیکھا، حشرات کو دیکھ کر اپنی خوراک کو ذخیرہ کرنا، اسی طرح جانوروں کو سینگوں سے لڑتے دیکھ کر ہی انسان نے اپنے دفاع کے لیے ہتھیار بنانے کا طریقہ سیکھا۔ پھر آگ کی ایجاد سے کھانا پکا کر کھانا بھی انسان کی تہذیب کا حصہ بنا۔ یوں انسان نے آہستہ آہستہ وحشی پن کو چھوڑ کر ایک نظم و ضبط کے تحت زندگی بسر کرنا شروع کی تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں معاشرے کے رہنے والوں کے لیے معاشرتی اقدار بھی متعین ہوئیں یعنی انسان نے تہذیبی دائرے میں قدم رکھا۔

دنیا (کرہ ارض) میں سینکڑوں تہذیبیں موجود ہیں۔ ان تمام تہذیبوں کے رسم و رواج، روایات و اقدار اور طرز معاشرت الگ الگ ہیں۔ تہذیب و ثقافت اور انسان کا آپس میں تعلق لازم و ملزوم ہے کیونکہ انسان کے بغیر تہذیب و ثقافت کا وجود ممکن نہیں ہے اور تہذیب و ثقافت کے بغیر انسان نامکمل ہے، یوں تہذیب و ثقافت کا تعلق انسانی تخلیق سے ہے۔ تہذیب و ثقافت کسی بھی قوم کا طرز حیات سمجھی جاتی ہے۔ کسی بھی قوم سے تعلق رکھنے والے افراد کا رہن سہن، چال ڈھال، اٹھنا بیٹھنا، اور بول چال اس کی تہذیب یا کلچر کا حصہ ہوتے ہیں اور یہی کلچر یا تہذیب کسی بھی قوم کو دوسری قوموں کی تہذیب سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار، خوراک، لباس اور زبان اس کی پہچان یا شناخت ہوتے ہیں۔ جب کہ مذہب کو کلچر میں کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ کسی بھی ملک یا معاشرے کے لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا، لباس، عبادات

اور روایات اپنے مذہبی عقائد کے مطابق ہوتے ہیں تو یہی عناصر معاشرے میں موجود ہر فرد پر براہ راست اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔

تہذیب اور ثقافت کی تعریف:

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ماخذ اور مادہ ذ،ہ،ب ہے اس کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا، درخت کی کانٹ چھانٹ کرنا، تراشنا، انسانیت، رسم رواج اور سوسائٹی کے ہیں۔ تہذیب کے لغوی معنی شائستگی اور آراستگی مراد لیے جاتے ہیں۔ جب کہ انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے سویلائزیشن(civilization)اور ثقافت کے لیے(culture) کے الفاظ مستعمل ہیں۔ عربی میں الثقافتہ، اردو میں تہذیب، ثقافت، تمدن کے الفاظ بھی زیر استعمال ہوتے ہیں۔ یوں یہ تمام الفاظ مترادف معنوں میں استعمال ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر ان الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کو دیکھا جائے تو مختلف لغات میں تہذیب و ثقافت کی مختلف تعریفیں بیان ہوئیں ہیں۔ مثال کے طور پر فرہنگ آصفہ میں تہذیب کے معنی ہیں۔ "آراستگی، صفائی، پاکی، درستی اور اصلاح۔"[1]

فیروز اللغات میں تہذیب کے معنی کلچر لکھے گئے ہیں جبکہ فیروز اللغات عربی اردو مطبوعہ ۱۹۶۸ میں مادہ، ث ق ف کے ذیل میں ثقافت کے لغوی معنی عقل و سمجھ، تعلیم و تربیت تحریر کئے گئے ہیں۔

تاج۔العروس میں آیا ہے۔

"اصل التھذیب والھذب تنقیہ الاشجار یقطع الااطرف تزید نمو او حسنا تم استعملو افی تنقیہ کل شئ و اصلاحہ و تخلیصہ من الشوائب حتی صار حقیقہ عرفیہ۔"[2]

ترجمہ؛ تہذیب اور ھذب کی اصل درختوں کی کانٹ چھانٹ کرنا ہے۔ تاکہ نمو پائیں اور ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو بعد ازاں ہر شے کی صفائی، اصلاح اور عیوب سے پاک ہونے کے استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی حقیقت عرفیہ بن گیا۔

اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں ثقافت کے معنی یوں لکھے گئے ہیں۔

"کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔"[3]

لسان العرب میں ثقافت کے معنی یوں درج ہیں۔

"ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے، ثقافت کا لفظ ثقف سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ذہین، صاف ستھرے اور مہذب کے ہیں۔"[4]

ان لغات کے مطالعے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کے الفاظ عام طور پر اکٹھے استعمال ہوتے ہیں اور بعض اوقات انہیں ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی لیا جاتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کی تعریف کے حوالے سے بات کی جائے تو مختلف اہل علم اور مفکرین نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس لفظ کے حوالے سے نظریات پیش کئے ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر اہل مغرب اور مشرق کے مفکرین کے ہاں اس لفظ تہذیب و ثقافت کی تعریف اور نظریات بیان کرنے میں اختلافات پایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے لفظ تہذیب و ثقافت کی کوئی مخصوص تعریف متعین نہیں ہو سکی۔ اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو میں تہذیب و ثقافت کے مباحث کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خان کے ہاں ملتا ہے۔ اس حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں کہ:

> سر سید احمد خان غالباً پہلے دانشور ہیں جنہوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔ انہوں نے تہذیب کی جامع تعریف کی اور تہذیب کے عناصر و عوامل کا بھی جائزہ لیا۔ چنانچہ اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے سر سید پرچے کی پہلی اشاعت (۱۸۷۰ء) میں لکھتے ہیں کہ اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی (civilization) سولزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلائیں۔ سولزیشن انگریزی کا لفظ ہے جس کا ترجمہ تہذیب ہم نے کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے کہ انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔[۵]

اردو محققین کے تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے نظریات:

اردو مصنفین میں سر سید احمد کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، مولانا مودودی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، سید عابد حسین اور سبط حسن کے ہاں بھی تہذیب و ثقافت کے مباحث کا ذکر اور اس کے بارے میں مختلف نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ " جمیل جالبی تہذیب و ثقافت کے مابین فرق کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب کا تعلق انسان کی ان خارجی چیزوں سے ہوتا ہے جس میں کسی بھی شخص کے عادات و اطوار، گفتار،

کردار، طرزِ عمل (رہن سہن) اور خوش اخلاق (بول چال) وغیرہ شامل ہو۔ جب کہ ثقافت کا تعلق ہماری ان ذہنی صفات سے ہے جس میں علوم وفنون شامل ہیں، یعنی وہ چیزیں جو ہمارے ذہن، سوچ وخیالات سے جڑی ہوں یا ہماری ذہنی صلاحیتوں، شعور اور تخیل کا حصہ ہوں، جمیل جالبی تہذیب وثقافت کے لیے کلچر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کلچر اس باضابطہ عمل کو کہا جاتا ہے جس میں معاشرے میں موجود لوگ اپنی اقدار کے مطابق زندگی آزادانہ طور پر گزار سکیں۔ اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ کلچر وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے اس لیے انسان کو اپنے کلچر میں تبدیلی کو قبول کرنا چاہیے۔[۶]

سید عبداللہ اپنی کتاب کلچر کا مسئلہ میں تہذیب وثقافت کو کھانے پینے کے آداب، رہنے سہنے کے طریقے، میل جول کے آداب، رسم ورواج، شادی بیاہ، میلے، تہوار، موسیقی، شعر گوئی، مجلسی تقریبات، کھیل اور آلائش وزیبائش سے عبارت کرتے ہیں نیز سید عبداللہ بھی جمیل جالبی کی طرح تہذیب وثقافت کے لیے کلچر کی اصطلاح کو اپناتے ہیں اور تہذیب وثقافت کو مذہب کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ سید عبداللہ یہ بتاتے ہیں کہ کسی بھی مذہب کے کائنات کے بارے میں، خالق اور مخلوق کے بارے میں، زندگی اور موت کے بارے میں جو بنیادی تصورات اور نظریات ہوتے ہیں انہیں پر اس مذہب کے لوگوں کی تہذیب وثقافت تشکیل پاتی ہے۔[۷]

فیض احمد فیض تہذیب وثقافت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تہذیب اور ثقافت میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے وہ تہذیب کو کلچر کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم کلچر اور سولزیشن کو الگ الگ کر کے پرکھیں تو کلچر طرزِ زندگی کا نام ہے اور اس کی جو مختلف قسم کی صورتیں ہیں (مثلاً رہن سہن، اقدار، پیداوار کے طریقے، علم وادب، سماجی تعلقات، رسوم وروایات اور طرزِ حیات کی بنیادی قدریں) فیض انہیں سولزیشن یعنی تہذیب کہتے ہیں۔ فیض احمد فیض کے نزدیک ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین نمایاں پہلو ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہی کسی بھی قوم کی تہذیب وثقافت ترقی کے منازل طے کرتی ہے یا پھر زوال پذیر ہوتی ہے۔ ایک کسی بھی قوم کی اقدار، احساسات اور عقائد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ دوسرے اس قوم یا معاشرے میں رہنے والوں کا رہن سہن، طور طریقے، ان کے آداب اور اخلاقی وظاہری قدریں۔ تیسرا اس قوم کے علوم وفنون، تعمیرات، موسیقی، آرٹ وغیرہ۔ فیض احمد فیض کے نزدیک یہ تینوں پہلو ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں اور اقدار کو عزیز رکھتا ہے، انسان اس

کے مطابق ہی اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔اور جب معاشرے کے حالات وواقعات بدلتے ہیں تو اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود اقدار بھی تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کا اظہار علوم وفنون میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔یوں فیض کے ہاں قوم، کلچر اور تہذیب لازم وملزوم ہیں [۸]۔

وزیر آغا تہذیب اور ثقافت کے مباحث کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں زیادہ تر ناقدین لفظ تہذیب اور ثقافت کی مخصوص تعریف کرنے سے قاصر رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ وہ لفظ تہذیب کو کلچر (culture) کے مترادف لیتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے تہذیب کو تمدن کا روحانی پہلو قرار دے دیتے ہیں جس کی وجہ سے تہذیب اور ثقافت کے مباحث سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔وزیر آغا تہذیب اور ثقافت کے مابین فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تہذیب اور ثقافت میں وہی فرق ہے جو کسی بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں ہوتا ہے۔یعنی کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔وہ ثقافت کو زمین سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس زمین (جو تخلیقیت کا مظاہرہ کرتی ہے) سے جو کچھ اگاتا ہے اسے وہ تہذیب کہتے ہیں ۔یوں وزیر آغا تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے ہیں۔[۹]

سبط حسن کے ہاں تہذیب کا تصور دراصل انسان سے ہے۔" وہ لکھتے ہیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا مہذب یا تہذیب یافتہ ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شخص کے بات چیت کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طریقہ ہمارے روایتی معیار کے مطابق ہوتا ہے۔وہ معاشرے میں موجود اقدار کو اور سماجی فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کرتا ہے۔[۱۰]

سبط حسن کے نزدیک تہذیب ہی وہ بنیادی اور انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا میں موجود تمام تخلیقات سے ایک الگ مقام اور درجہ رکھتا ہے۔سبط حسن کا کہنا ہے کہ انسان میں ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں موجود نہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے ہی انسان تہذیب پر قدرت رکھتا ہے ۔سبط حسن ان خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب دراصل ایک انسانی تخلیق ہے۔انسان کے بنا تہذیب کا کوئی وجود نہیں ہے۔اس کی مثال وہ یوں دیتے ہیں کہ انسان ماں کے پیٹ سے تہذیب لے کر دنیا میں نہیں آتا بلکہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول، معاشرے سے ہی رہن سہن کے طریقے، بات چیت کرنے کے آداب اور سماجی تعلقات سیکھتا ہے۔یوں تہذیب ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوتی ہے۔بلکہ تہذیب انسان اپنے ماحول

اور معاشرے سے سیکھتا ہے اور انہی رسوم و روایات، اقدار، لباس اور خوراک کو اپناتا ہے جو اس کے معاشرے میں رائج تھیں۔

تہذیب کی تشکیل کے عناصر ترکیبی:

دنیا میں موجود ہر تہذیب کسی نہ کسی عناصر ترکیبی سے مل کر ہی تشکیل پاتی ہے۔ تہذیب اور ثقافت کی تشکیل میں جو عناصر کلیدی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں مذاہب، عقائد اور اقدار تو ہیں ہی ان کے علاوہ سیاسی و معاشی نظام، طبعی حالات، خوراک، لباس، زبان، رسوم و روایات، جغرافیائی حالات اور مختلف علوم و فنون بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، کیونکہ یہی عناصر کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت کو متعین کرنے یا تقویت دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اگر تاریخ کی طرف نظر ڈالی جائے تو ارتقائی مراحل میں انسان کے ارضیاتی حالات کیا تھے؟ یعنی انسان ابتدائی دور میں کس طرح اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح اپنی زندگی گزارتا تھا جو مل گیا وہ کھالیا، اس دور کا انسان تہذیب یافتہ نہیں تھا۔ جوں جوں انسان نے اپنے شعور کا استعمال کرنا شروع کیا تو اسے زمین سے فائدے بھی دیکھنا شروع ہوئے۔ انسان نے زمین میں بیج بو کر پھل اگانا سیکھا پھر اسے اپنی خوراک کا ذریعہ بنایا، یوں انسان نے اپنی تہذیب و ثقافت کی پہلی مثال زراعت کے ذریعے سے بنائی۔

پھر آہستہ آہستہ انسان نے ترقی کی تو کاشت کاری کرنا شروع کی۔ اس دور کی تہذیب مختلف تھی اور موجودہ دور کی تہذیب میں بھی فرق ہے۔ جیسے جیسے انسان شعوری طور پر ترقی کرتا ہے اس کی تہذیب بھی ترقی کرتی رہتی ہے، کیونکہ اللہ نے انسان کو اشرف مخلوقات بنایا ہے اسے عقل اور باشعور ذہن دیا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر انسان نئے نئے تجربات کرتا رہتا ہے، اس کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ اسی تبدیلی اور ترقی کی وجہ سے انسانی تہذیب بھی ترقی کرتی رہتی ہے۔

تہذیب کی تشکیل میں دوسرا اہم عنصر طبعی و جغرافیائی حالات ہیں۔ انسان جس جگہ رہتا ہے وہاں کا ماحول، رہن سہن، موسم، آب و ہوا، ذریعہ معاش، خوراک اور اس علاقے کے رہنے والے لوگوں کا انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہنا عام بات ہے۔ کیونکہ انسان جس علاقے میں رہتا ہے اس ماحول سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر علاقے کی تہذیب دوسرے علاقے کی تہذیب سے مختلف ہوتی ہے اور اس کے مختلف ہونے کی وجہ اُس علاقے کی طبعی اور جغرافیائی حالات ہوتے ہیں۔ انسان کے جیسے طبعی حالات ہوں گے اس کے مطابق ہی اس کی

تہذیب ہو گی مثال کے طور پر سمندر اور دریاؤں کے کنارے بسنے والے لوگوں کا رہن سہن، خوراک، لباس، ماحول، عادات اطوار، اخلاق اور جذبات و احساسات خشک علاقے میں رہنے والے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

تہذیب کی تشکیل میں تیسرا عنصر سیاسی و معاشی حالات ہیں۔ کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت اس وقت تک ترقی کے مراحل طے نہیں کر سکتی جب تک اُس قوم کی سیاسی و معاشی حالات مستحکم نہ ہوں۔ ابتدائی دور میں انسان کے سیاسی و معاشی حالات مختلف تھے مثال کے طور پر پہلے انسان گاؤں میں رہتا تھا۔ پھر اس نے شہر میں بسنا شروع کیا اسے شہر میں رہنے کے لیے معاشی ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شہروں میں تاجر سفر کرتے اور سامان کے خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ اپنے سوچ و خیالات کا تبادلہ بھی کرتے رہتے۔ یوں تہذیب نے انسان کو متمدن کر دیا۔ اسی طرح ترقی کرتے ہوئے انسان نے صنعتوں پر توجہ دی۔ یوں ابتدا سے دہرانے والے عمل کو تہذیب کہا گیا۔

کسی بھی کلچر کی تشکیل میں یہی تین پہلو مذہب، سماج اور سیاست اہم سمجھے جاتے ہیں۔ حسن منظر نے اپنے ناولوں میں تقریباً ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ مذہب کو چونکہ تہذیب و ثقافت میں کلیدی کردار کی حیثیت دی جاتی ہے اس لئے بھی ان کے ناولوں کے کردار ہر مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماں بیٹی ناول میں مصنف نے عیسائی مذاہب کے کردار تخلیق کئے ہیں۔ ناول بیر شیبا کی لڑکی اور حبس میں یہودی مذہب کے ساتھ ساتھ مسلم مذہب کے کردار بیان ہوئے ہیں۔ انسان، اے انسان اور دھنی بخش کے بیٹے میں مسلم کردار، بدھ مت مذاہب اور ہندو مذاہب کے کردار تخلیق کئے ہیں اور اسی طرح اپنے ناول العاصفہ میں حسن منظر عرب کرداروں کے ذریعے سے عرب ممالک کی معاشرت کو ناول کا موضوع بناتے ہیں۔ یوں ان کے تقریباً تمام ناولوں کے کردار اپنے کلچر کو منتخب کیے ہوئے ہیں جو کہ اپنی اپنی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

تہذیبی و سماجی اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ:

حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں مغربی اور مشرقی ماحول کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ وہاں کے سیاسی، سماجی، لسانی اور تہذیبی حالات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہی ناول میں کرداروں کے ذریعے سے مختلف تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان رویوں میں کھانے پینے کے آداب، رہن سہن کے طریقے، عقائد، عبادات، تہوار اور معاشرتی و اخلاقی قدریں شامل ہیں۔ جیسا کہ ہر قوم کی

تہذیب کسی بھی قوم سے مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ہر قوم کا مذہب اور ہر طبقے کے لوگوں کی تہذیبی قدریں بھی مختلف ہوتیں ہیں۔ حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں ہر کردار ہمیں اپنے طبقے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی و ثقافتی قدروں کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے کو دو حصوں میں تقسیم کرکے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ناول کا پہلا حصہ دھنی بخش گاؤں کی دیہاتی زندگی، مشرقی تہذیب، سماج کی کمزوریوں، سیاسی نظام، معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور غریبوں کے استحصال سے منسلک ہے جب کہ ناول کے دوسرے حصے کو مصنف نے بیرون ممالک رہنے والے ان لوگوں سے جوڑا ہے جو اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی نہ کسی وجوہات کی بنا پر میزبان ممالک میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے تارکین وطن کو بیرون ممالک میں نہ صرف شناخت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی روایات و اقدار، رسوم ورواج اور تہذیب کو جب ختم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنی مٹی، روایات و اقدار سے دوری جب ایسے تارکین وطن کو اپنے ملک لوٹ جانے پر مجبور کرتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا ملک ویسے کا ویسا ہی ہے جہاں کچھ بھی نہیں بدلا۔ وہی بے انصافی، غربت، کرپشن، بے روزگاری، طبقاتی تقسیم، غلامانہ سوچ اور استحصال کا شکار لوگ موجود ہیں تو وہ مایوس ہو کر واپس بیرون ممالک چلے جاتے ہیں ۔ حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں انہی دو تہذیبوں کے تضادات بیان ہوئے ہیں۔ روبینہ سلطان ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "دھنی بخش کے بیٹے کی آئیڈیالوجی میں دو تہذیبوں کا تصادم اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔"[۱۱]

ناول میں مصنف نے انہی دو جہات کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے احمد بخش کے کردار کے ذریعے سے تارکین وطن کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ احمد بخش کا تعلق پاکستان میں سندھ کے ایک ایسے گاؤں سے ہے جہاں اس کے خاندان یعنی آباؤ اجداد کا راج ہے۔ دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش اور علی بخش دو متضاد کردار دکھائے گئے ہیں۔ غفور احمد ناول دھنی بخش کے بیٹے کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> اس ناول میں وہ ہمارے معاشرتی ناسوروں، فرسودہ روایتوں اور جاگیردارانہ نظام میں جکڑے ہوئے غریب اور محنت کش عوام، سب کے دکھوں کی مسیحائی کرتے نظر آتے ہیں۔ احمد بخش اور علی بخش کی کردار نگاری میں کچھ افراط و تفریط کے علاوہ انہوں نے حقیقت پسندی کو بڑی حد تک نبھایا ہے۔[۱۲]

گاؤں دھنی بخش پر علی بخش کا راج ہے وہ ہر برائی کے کام میں ملوث ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی بھی اُس کے کاموں میں رکاوٹ نہ بنے۔ علی بخش کے لیے شراب اور شباب ہی سب کچھ ہیں۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے

میں علی بخش کا کردار جاگیر دارانہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ناول میں یہ کردار اپنی شخصیت میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے زوال پذیر ہے۔ علی بخش کا کردار عیش و عشرت، شراب اور شباب کا دلدادہ ہے۔یہ کردار ناچ گانوں کی محفلوں کا اہتمام کرنے، عورتوں کو گھر اٹھالانے، علاقے کے افسروں کو رشوت دینے اور گاؤں کے لوگوں کو حقیر سمجھنے والا جاگیر دار دکھایا گیا ہے۔ اپنی کوئی بھی جائز اور ناجائز باتیں منوانے کے لئے وہ روپیہ پیسا پانی کی طرح بہاتا ہے۔ علی بخش کا بس یہی شوق ہے شادیاں کرتے جانا اور اپنی اسی عیاش طبیعت کے باعث وہ پانچ شادیاں کر چکا ہے۔

علی بخش کئی مزاروں پر حاضری دیتا رہتا ہے۔ وہ جادوٹونے اور تعویذ دھاگوں سے ڈرتا بھی ہے۔ یہاں حسن منظر نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے دیہاتی معاشرے کا ایک بڑا طبقہ اس پیر پرستی، جادوٹونے اور توہمات پرستی کا شکار ہے۔مصنف نے ناول میں علی بخش اور اس کی دوسری بیوی لاڈلی کے کرداروں کے توسط سے ان معاشرتی رویوں کا پردہ چاک کیا ہے جو ان عناصر میں ملوث ہو کر نہ صرف لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں بلکہ ان سے پیسے بھی وصولتے ہیں۔

حسن منظر نے دھنی بخش کے بیٹے میں علی بخش کی بیوی حرمت کے کردار کے ذریعے سے ان جاگیر دار بیویوں کی عکاسی کی ہے جو اپنے شوہر میں ہر برائی موجود ہونے کے باوجود ان کے آگے سر تسلیم خم ہیں۔ان کے نزدیک اگر شوہر کسی دوسری عورت سے تعلقات قائم کر کے دوگھڑی سکون حاصل کر رہا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے کیونکہ عورت کا کام ہی شوہر کو آرام وسکوں مہیا کرنا ہے۔ناول میں حرمت کا کردار اپنی کسی بھی سوکن یا پھر دوسری عورتوں سے رقابت اور حسد کا جذبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ علی بخش کی پانچویں بیوی مریم کی جو تقریباً تیرہ برس کی ہے اس کی پرورش اور دیکھ بھال دل وجان سے کرتی ہے کہ آخر کو یہ بھی علی بخش کی بیوی بنے گی۔

دھنی بخش کے بیٹے میں منظر اس پہلو کو بیان کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے میں اب اخلاقی اور مذہبی اقدار کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔پاکستان میں گاؤں ہو یا پھر شہر عورتوں کو ذہنی وجسمانی دونوں سطحوں پر جنسی تشدد کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی نظام میں دوہرے تعلقات، رشوت، کرپشن، بے روزگاری اور حاکم و محکوم کے مسائل نے انسان کو انسان رہنے ہی نہیں دیا ہے۔ خاص کر دیہات کے لوگ اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم اور سلوک پر خاموش ہیں اور ان کی خاموشی ہی معاشرے میں اخلاقی اور تہذیبی بحران کا سبب بن جاتی ہے۔ گاؤں دھنی بخش کی اخلاقی و تہذیبی زوال کی وجہ بیان کرتے ہوئے احمد بخش کہتا ہے کہ:

> مشکل یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے ہونے پر خود اپنی شناخت بدل دیتے ہیں۔بڑی آسانی سے حاکم و محکوم بن جاتے ہیں۔ساتھی نہیں رہتے، خواہ اس کی توقع ان سے کی جائے یا نہیں۔کم حیثیت پرانے دوست جب ملتے ہیں ایسے ملتے ہیں جیسے غلام ہوں اور باحیثیت پرانے

دوست ساتھی خود اسے اپنا بیاج سمجھنے لگتے ہیں۔ جسے ادا کرنا ان کے نزدیک کم حیثیتوں پر
فرض ہوتا ہے۔ [۳۱]

دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش طبقاتی تقسیم اور جاگیر دارانہ نظام کو ناپسند کرتا ہے اور اسی حاکم و محکوم کے نظام سے تنگ آ کر گاؤں سے شہر اور پھر شہر سے بیرون ملک ترک سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ امریکا میں رہتے ہوئے پہلے تو احمد بخش کو تنہائی کا احساس ستانے لگتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ پڑھائی کے مکمل ہو جانے کے بعد واپس اپنے ملک لوٹ جاؤں گا لیکن خطوط کے ذریعے سے احمد بخش کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ گاؤں اور ملک کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ وطن واپسی کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے احمد بخش کا ذہن شعوری اور لا شعوری طور پر اپنے ملک اور بیرون ملک کا تقابل کرتا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس ملک میں (جہاں وہ قیام پذیر ہے) کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاتی، کسی کا حق نہیں مارا جاتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ اسے جلد اس فیصلے پر پہنچاتا ہے کہ امریکہ میں موجود تارکین وطن سب ہی بظاہر ایک اچھی زندگی جی رہے ہیں پر در حقیقت سب ہی اس معاشرے میں جہاں جنسی بے راہ روی، لادینیت اور کلچر شاک کے فروغ کے مسائل موجود ہیں وہاں وہ اپنی نسل کو بڑھتے اور بستے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ موجود ہوتے ہیں تو مختلف کلچر شاک وجود میں آتے ہیں اور اسی کلچر شاک کی وجہ سے ہی بیرون ممالک رہنے والے تارکین وطن اپنی روایات و اقدار کی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں۔

امریکہ میں احمد بخش کی ملاقات اولا نامی ایک لڑکی سے ہوتی ہے جو سویڈش ہے اور ادب سے بے حد لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی کہانیاں لکھتی رہتی ہے۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے میں اولا کا کردار ایک ایسی تہذیب کا نمائندہ دکھایا گیا ہے جو تغیر پذیر ہے۔ ایک ایسا کردار ہے جو منفی اثرات کو نہ صرف رد کرتا ہے بلکہ مغربی معاشرے میں موجود مثبت اثرات قبول کرنے کا حامی بھی ہے یعنی ایسا وجود جو جہاں بھی جائے وہاں کے ماحول، رہن سہن اور آب و ہوا میں خود کو ایڈجسٹ کر لیتا ہے۔

احمد بخش اور اولا چند ہی ملاقاتوں میں ایک دوسرے سے اپنی پسند کا اظہار کرتے ہوئے شادی کر لینے کا ارادہ کرتے ہیں، یہاں ایک بار پھر سے احمد بخش کا ذہن عجب کشمکش کے عالم میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے خیالات آنے لگتے ہیں کہ ایک سویڈش لڑکی سے شادی جس کی تہذیب، روایات، اقدار اور مذہب سب کچھ میری روایات، اقدار اور مذہب سے مختلف ہے، کتنی کامیاب رہے گی اور کتنی ناکام۔ یہی باتیں احمد بخش کے کردار کو تہذیبی و سماجی اقدار کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور وہ اس بارے

میں سوچنے لگتا ہے کہ آگے جا کر ہمارے بچوں کا مستقبل کیا ہو گا، وہ کون سا مذہب اپنائیں گئے۔ کہیں بڑھاپے میں اولا مجھے چرچ نہ لے جائے اور میں کہیں ملانہ بن جاؤں جیسی باتیں اسے ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ احمد بخش کی اسی ذہنی الجھن کو دیکھتے ہوئے اولا کہتی ہے کہ:

> یہ پچھلے چند دنوں سے تم کس سوچ میں کھوئے ہو؟ کبھی اتنے دنوں بعد کے ساتھ کے بعد پوچھنے لگتے ہو تم نے بائبل پڑھی ہے؟ کبھی ہمارے بچوں کا مذہب کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے تمہارا بے لوث شادی کا خیال اتنا بے لوث نہیں ہے جتنا تم جتاتے آئے ہو۔ تمہاری ایک فکر شادی سے پہلے کی ہے، دوسری شادی کے بعد کی۔ احمد بخش نے کئی بار اپنے خیالات کو ایسے جملوں میں لانے کی کوشش کی جو اولا کے کانوں پر موٹے اولوں کی طرح نہ گریں اور اس کے دماغ کو سن کر جائیں۔ پھر اس نے کہا، "اولا میری ایک ہی خواہش ہے، یہی خواہش، کہ شادی کے بعد ہمارے بیچ میں کوئی ایسی چیز نہ ابھرے جو ہماری شادی کو ناکام بنادے۔"[۴۵]

تہذیبی و ثقافتی اقدار کی شکست و ریخت اور اخلاقی زوال کے حوالے سے ناول العاصفہ حسن منظر کی فکر کے خدوخال کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ حسن منظر نے اس ناول میں عرب ممالک کی معاشرتی و تہذیبی گراوٹ کے اسباب کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عرب ممالک پر غیر ملکی لوگوں کی اجارہ داری کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں جو ماحول اور معاشرہ پیش کیا گیا ہے وہ تہذیبی بحران کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

مصنف نے ناول میں نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے کھوکھلے پن اور عرب ممالک میں غیر ملکی لوگوں کا عربوں کے ساتھ سلوک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی و نفسیاتی مسائل کا سفاکانہ تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح نچلے طبقے کے کردار جن میں زید، اس کی بہن لوءلوء اور محبوبہ منیرہ شامل ہیں جذباتی و معاشرتی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

العاصفہ میں حسن منظر نے تہذیبی بحران، عالمی انتشار، انسانیت کے فقدان اور انسانی زندگی کی مختلف کروٹوں کی نمائندگی ناول کے مرکزی کردار زید کے ذریعے سے کی ہے۔ مصنف نے اسی کردار کے توسط سے عرب ممالک کی عوام، ان کے مسائل، سیاسی چپقلش، سماجی اور معاشی صورتحال کو بیان کیا ہے۔ ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے تو یہ کردار یعنی زید واحد متکلم کی صورت میں عرب ممالک کی پوری تہذیب و ثقافت کو قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہ کردار وہاں کے سرکاری افسروں، حکومت، سیاسی بدعنوانیاں، حکومتی وزراء کی نااہلیوں کے اسباب، غیر

ملکی لوگوں کا عرب ملک پر قبضہ اور عرب صحافت پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔یوں ناول العاصفہ میں زید کا کردار گہری بصیرت کا حامل دکھایا گیا ہے

العاصفہ میں عرب ممالک کے تمام تہذیبی و سماجی، سیاسی و ثقافتی واقعات کی تفصیل کو اسی کردار کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں ایسے نچلے طبقے اور زوال پذیر معاشرے کی کہانی پیش کی گئی ہے جو اپنے حقوق سے ناآشنا ہیں اور مردہ ضمیر کے مالک بھی ہیں۔اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> حسن منظر کا ناولٹ "العاصفہ" ہے، جس کا واحد متکلم راوی "زید" کسی خلیجی ریاست کی پوری تہذیب کا نمائندہ ہے اور ہمیں اس بیمار معاشرے سے آگاہی بخشتا ہے جس کی ریت کالا سونا اگل رہی ہے اور اس بہتے ہوئے سونے پر بے کردار امریکی پل رہے ہیں۔ جن کے دلوں میں نہ عرب زمین کی عزت ہے جس سے تیل نکلتا ہے اور نہ اس کے انسانوں کی۔۔۔۔۔یہ ناول آج کی تہذیب کا سائیکارٹی مطالعہ ہے اور اردو زبان کے قاری کو جھنجھوڑ ڈالنے والی آگہی فراہم کرتا ہے[۱۵]۔

ناول العاصفہ کا مرکزی کردار زید ہے اور ناول کی کہانی کا تانا بنا اسی کردار کے گرد بُنا گیا ہے۔ العاصفہ میں زید عرب معاشرے میں موجود برائیوں، تہذیب و تمدن کے تضادات، سیاسی نظام کے دہرے معیار اور اپنے معاشرے میں موجود سسٹم سے شاکی نظر آتا ہے۔زید کا تعلق عرب ملک کے ایک بے نام علاقے سے ہے۔زید کا کردار ناول میں بچپن سے ہی محنتی اور حساس لڑکے کا دکھایا گیا ہے جو اپنے باپ کی شراب نوشی، دھوکہ دھری اور خود غرضی کی وجہ سے اس سے نفرت کرتا ہے۔وہ لڑکپن میں ہی مختلف دکانوں میں مزدوری کرتا ہے اور گھر کا خرچہ اٹھتا ہے۔

العاصفہ میں حسن منظر نے زید کے باپ کو عرب معاشرے کی اخلاقی وسماجی قدروں کی زوال پذیری کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول میں زید کے باپ کا کردار اخلاقی پستیوں کا ایک نمائندہ کردار دکھایا گیا ہے جو غیر تہذیب یافتہ ہے۔ناول کے آغاز ہی میں زید اپنے باپ کا تعارف کچھ یوں کراتا ہے۔

> میں نے اپنے باپ کو مزدوروں کے ساتھ آتے دیکھا۔وہ لوگ برقی تار ٹھیک کرنے کی پہیوں والی سیڑھی کو دھکیلتے لئے جارہے تھے۔ہم ایک دوسرے کے سامنے پہنچ کر مدھم ہوئے۔وہ سگریٹ سلگانے کے بہانے سے اور میں بیٹھے بیٹھے اپنی سائیکل پر۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے گلابی کنیر

کے درخت ہل رہے تھے پھر ایکا ایکی بغیر اس کی ناک کو چومے میں پیڈل مار کر آگے بڑھ گیا۔۔۔ دور سے میں نے اسے پلیٹ کر دیکھا وہ لوگ بدوؤں کی طرح ہو، ہو۔۔۔ ہو، ہو، ہو ۔۔۔ ہو کے رونے والے لہجے میں گا رہے تھے۔۔۔ اس کا شراب سے سوکھا ہوا جسم سلھوت کی طرح افق کے بالمقابل نظر آرہا تھا۔ پھر وہ لوگ ہنسی سے دہرے ہو کر سڑک پر بیٹھ گئے۔ یہ میرا باپ تھا۔[71]

العاصفہ میں زید کے باپ علی ابن سعید نے اپنی تمام اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ زید کا باپ اپنے مفادات کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی بیچ دینے پر آمادہ ہے، وہ خود نہ صرف شراب نوشی کرتا ہے بلکہ شراب، شباب اور منشیات کا کاروبار بھی سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ اپنی انہی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے علی ابن سعید اپنے بیٹے کی محنت کی تمام کمائی خرچ کر دیتا ہے۔ اپنے باپ کی شادیوں، بے حیائی، خود غرضی اور مفاد پرستی نے ہی زید کو اس سے نفرت کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس سب کے باوجود زید چاہ کر بھی اپنے باپ سے رشتہ ختم نہیں کرپاتا ہے۔ العاصفہ میں علی ابن سعید کے کردار کے ذریعے سے منظر صاحب نے ایسی معاشرت کو دکھایا ہے جو تہذیبی قدروں میں زوال کا باعث ہے۔ منافقت سے بھرپور یہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنے قول اور فعل میں تضاد رکھتا ہے۔

حسن منظر نے اپنے ناول العاصفہ میں ایک ایسے نچلے طبقے اور زوال پذیر عرب معاشرے کی کہانی کو مرکزی نکتہ بتایا ہے جو مادہ پرستی کا شکار ہے اور یہ مادہ پرستی انسان کی رگوں میں اس قدر سرائیت اختیار کر چکی ہے کہ انسان اپنی تمام اخلاقی اور روحانی قدروں کو مسخ کر چکا ہے۔ عرب ملک کی یہی سماجی زندگی اور معاشرتی اقدار انسانی شخصیت و نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ملک میں رہنے والے لوگوں کی نہ تو کوئی اپنی خاص سوچ ہے اور نہ ہی عمل جس کے مطابق وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کچھ کام کر سکیں۔ اس کی مثال ناول کے مرکزی کردار زید میں دیکھی جاسکتی ہے جو اپنے ملک کے سیاسی و سماجی نظام، معاشرے میں موجود ناہمواریوں اور قانون کے دوہرے معیار سے تنگ ہے۔ وہ خود ایک بدو عرب ہے لیکن ناول میں واحد متکلم کی صورت میں نفرت بھرے لہجے سے عربوں کی زندگی کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ زید عرب معاشرے کی زندگی کا اظہار اپنے لفظوں سے یوں کرتا ہے۔

ہمارے ہاں ننگا دھوکا ہے، بے ایمانی اور مجبوروں کو لوٹنے کی بے اندازہ قوت۔ کسی کے پاس زندگی کا کوئی مقصد کاروں، بندوقوں، الیکٹرونک اشیا، بیویوں، برفیوم اور عالی شان بیوت کے سوا

نہیں ہے۔ اگر پہلے ہو گا بھی ہے بینزین (پیٹرول) نے اسے دھو دیا ہے۔ بس ایک وہی چیز یہاں وافر ہے اور لوگ سمجھتے ہیں دائم۔ ذہن کے جن کھیتوں کو اس کی آب یاری ہے وہ زندگی کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی اپج کھو چکے ہیں۔ عورتوں کے پاس اپنی زندگی کا کوئی علاحدہ مقصد نہیں ہے۔ وہی ہے جو ان کے گھر کے مردوں کا۔[۱۷]

ناول العاصفہ میں ایک ایسے گھر کو مرکز بنایا گیا ہے جو نچلے طبقے سے وابستہ ہے۔ اسی وجہ سے گھر کے معاشی حالات خراب ہیں۔ اس گھر کے افراد میں لوءلوء کا کردار ایک ایسے مظلوم طبقے کے نمائندگی کرتا ہے، جو استحصال کا شکار ہے۔ لوءلوء چونکہ زید کی سوتیلی بہن ہے تو اس لیے گھر کے بڑے اس پر ظلم و ستم کرنے سے باز نہیں آتے۔ جس کی روشن مثال ناول میں موجود زید کے ماں باپ ہیں۔ لوءلوء کا کردار عرب معاشرے میں عورتوں کے مظلوم طبقے، بے بسی اور غلامی کو ظاہر کرتا ہے، جہاں اب بھی بیٹیاں شادی کے نام پر فروخت کی جاتی ہیں۔ گھر کی بڑی لڑکی ہونے کی وجہ سے گھر کی تمام ذمہ داریاں لوءلوء کے سر ہیں۔ لوءلوء سب کا خیال رکھتی ہے لیکن گھر میں موجود افراد اس کے وجود سے بے نیاز ہیں۔

گھر کے معاشی حالات اور ظلم و ستم ہی لوءلوء کے کردار میں گھٹن کا سبب بنتے ہیں۔ اسی گھٹن، بے جا روک ٹوک اور گھر کے ماحول سے تنگ آ کر لوءلوء گھر سے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ ناول میں زید اور اس کی بہن لوءلوء کے کردار اپنے گھر کے کھوکھلے اور تضادات سے بھرپور ماحول سے دل برداشتہ ہیں اور وہ دونوں کسی بھی طور پر اپنے گھر اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام ہیں، وہ ایسے ماحول اور معاشرے سے اکتا چکے ہیں۔

حسن منظر نے ناول میں ان کرداروں کے ذریعے سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ گھر میں بچوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک، مار پیٹ اور اخلاقی برائیاں ہی انہیں نفسیاتی و جذباتی مسائل کا شکار بنا دیتی ہیں اور اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے ہی آنے والی نسل اور پرورش پانے والی دونوں نسلوں میں جذباتی اور نفسیاتی عدم توازن کا سبب بنتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان منظر صاحب کے اس ناول العاصفہ کے بارے میں تبصرہ کرتے کہتے ہیں کہ:

العاصفہ ایک عرب ملک کے معاشرتی، تہذیبی، اور سیاسی پس منظر میں تیار کردہ ایک ایسا ناول ہے جسے قارئین اس وجہ سے دلچسپ پائیں گے کہ وہ اب تک وہ عام طور سے ہندوستان اور پاکستان کے ماضی اور حال کے منظر ناموں سے واقف ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ ناول ایک مختلف کلچر سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ ایک ایسا کلچر جس کے افراد کے اعمال و افعال ہمارے لئے حیرت انگیز اور کہیں کہیں ناقابل یقین نظر آتے ہیں۔[۱۸]

العاصفہ میں حسن منظر نے ایسے کردار بھی تخلیق کئے ہیں جو عرب ممالک کی تہذیب و ثقافت کے امین ہیں لیکن یہی کردار جب اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں دوہرے طریقے اپناتے ہیں تو اپنی روایات و اقدار کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ یوں وہ قاری کے سامنے عرب ممالک کی زندگی کے پرت کھولتے نظر آتے ہیں۔

مصنف نے العاصفہ میں ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو عرب معاشرت میں تضادات کو بیان کرتا ہے، یہ کردار دراصل ایک مطوع کا کردار ہے جو نماز کے اوقات میں لوگوں پر ظلم و جبر کرتا رہتا ہے کہ دکانیں بند کرو اور نماز پڑھنے جاؤ۔ ناول میں مطوع کا کردار زید کو عجب کشمکش اور بے چینی میں مبتلا کئے رکھتا ہے۔ زید کے نزدیک مطوع کون ہوتا ہے جو انسان سے جبریہ نماز پڑھنے کا کہے۔ العاصفہ میں مصنف نے مطوع کے کردار کو ایسے لوگوں کی علامت بنا کر پیش کیا ہے جو خود حرام و حلال اور اخلاقی قدروں کی تمیز کھو چکے ہیں۔ چونکہ مطوع کو قانونی اختیار حاصل ہے اس لئے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کردار کے اعمال و افعال زید کو ذہنی و نفسیاتی عوارض کا شکار بنا رہے ہیں ۔ناول میں موجود مطوع کے کردار کے بارے میں زید اپنی کیفیات کا برملا اظہار یوں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> مطوع کی بھدی موٹی آواز اس دنیا کا مسمار کر دیتی تھی اور اگر میں اور محمد باتیں کر رہے ہوں تو ہماری باتوں کے سلسلے کو درہم برہم۔ بعض دفعہ اذان کے ساتھ ساتھ لیکن اکثر اذان ختم ہونے پر وہ اپنا عصا لے کر سڑکوں پر چل کھڑا ہوتا تھا۔۔۔۔۔ہر کھلی دکان کے سامنے وہ اپنا عصا گھما کر وہی دو لفظ پکارتا، صلوۃ، صلوۃ۔ صک دکانک،۔۔۔۔ لیکن کوئی اسے یہ حق کیسے دے سکتا تھا کہ وہ لوگوں سے نماز جبریہ پڑھوائے، خیر وہ بھی سہی لیکن، میں لڑکپن میں سوچا کرتا تھا، کیا دل دوسرے کے حکم پر ہاتھوں پیروں کی طرح کام کر سکتا ہے؟ آدمی کے جسم میں وہ تو بڑا بے حکما عضو ہے۔ کسی کو کوئی ایسی عورت سے محبت کرنے کا حکم دے سکتا ہے جس کی شکل اسے پسند نہ ہو ؟گھر والے کسی کی شادی کسی سے زبردستی تو کرا سکتے ہیں لیکن ایسی شادی اور محبت میں اتنا ہی فرق ہوگا جتنا زبردستی نماز کے وقت دکانیں بند کروانے اور دل سے نماز پڑھانے میں۔[۹]

العاصفہ میں حسن منظر نے ایسے ممالک کو بھی موضوع بنایا ہے جو اخلاقیات، روایات و اقدار اور اپنے مذہب سے دوری کی وجہ سے اخلاقی و تہذیبی زوال پذیری کا شکار ہو رہے ہیں اور اس زوال پذیری کا سبب وہ کردار دکھائے گئے ہیں جن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ معاشرے میں اپنی روایات و اقدار کے امین رہیں لیکن یہ کردار اپنے ملک میں جھوٹ، دھوکہ، رشوت، خیانت، مغربی کلچر اور جنس جیسے رزائل کو فروغ دے رہے ہیں۔ جیسا کہ ناول میں مطوع کا کردار اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا کام لوگوں کو نماز کی طرف راغب کرنا ہے۔ لیکن وہ خود

بھی نماز نہیں پڑھتا ہے اور لوگوں کو بھی صرف اس لیے سزا دیتا رہتا ہے کہ انہوں نے مطوع کے آنے کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس کے حکم کو بجالائے۔ یوں ناول میں ایک مذہبی کردار ہی لوگوں میں مذہبی دوری کا سبب بنتا ہے۔

حسن منظر کا یہ ناول دراصل معاشرے کی بے راہ وری، اخلاقی زوال اور معاشرے میں موجود برائیوں کی وجہ انسانی ذات کی شکست وریخت کو بیان کرتا ہے۔ مصنف نے العاصفہ میں ایسے عرب کردار بھی تخلیق کئے ہیں جو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ممالک سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور واپس لوٹ کر نہیں آتے۔ ایسے کردار بیرون ملک میں غلامی کی نوکری کرنے کو قبول کر لیتے ہیں لیکن اپنے ملک اور معاشرے کی ترقی میں حصہ لینے سے انکار کر دیتے ہیں اور جب یہی کردار بیرون ممالک رہتے ہیں تو غیر ملکی لوگوں کو عرب ممالک میں کام کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور یہ غیر ملکی لوگ ہی عرب ممالک پر اپنی اجارہ داری قائم کرتے ہوئے عرب معاشرے میں موجود لوگوں کو نہ صرف ذلیل کرتے رہتے ہیں بلکہ حقارت کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔ ناول میں ایک غیر ملکی کردار زید کو ان لفظوں سے مخاطب کرتا ہے۔

> ایک دن اس نے جب آس پاس کوئی نہیں تھا۔ چشمہ ہٹاتے ہوئے کہا، اپنے اصلی کام پر آگئے you characterless Arabs!o(تم بے کردار کے عرب) میں نے کہا اور تم انھیں ایسا بنانے والے you characterless Americans(تم کردار سے خالی امریکی!) تم لوگ عرب کے تیل پر پل رہے ہو اور تمھارے دلوں میں نہ عرب زمین کے لیے عزت ہے جس سے تیل نکلتا ہے، نہ اس کے انسانوں کی۔[۲۲]

ناول العاصفہ میں موجود یہ غیر ملکی کردار جو عرب ممالک میں آئل کمپنیوں میں ملازمت اختیار کیے ہوئے ہیں ایک طرف تو عرب ملک کی دولت پر قابض دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف یہی کردار عرب معاشرت میں تمدنی و ثقافتی زوال پذیری کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ یہ کردار عرب معاشرے میں رہتے ہوئے وہاں کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شراب، شباب اور دیگر مغربی طرز کی محفلوں کا سرعام اہتمام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عرب معاشرے کے سرکاری افسران یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی غیر ملکی لوگوں کو وہ سب اشیا مہیا کر رہے ہیں جو عرب ممالک کی تہذیبی و ثقافتی قدروں کا نقصان پہنچانے کا سبب بن رہی ہیں، عرب ممالک کے سرکاری حکمران اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں زید اپنی کیفیات کو یوں ظاہر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سب جانتے ہیں سفید تاجر ملک کو لوٹ رہے، لیکن ملک تک میں ہمت نہیں ہے کہ انھیں ملک سے نکل جانے کو کہے۔ ایسازور بس اپنے ملک والوں پر چلتا ہے یا ان کام کرنے والوں پر جو گرے پڑے ملکوں سے یہاں آتے ہیں۔۔۔۔۔اور تیل کا یہ دھوکہ دھڑی کا کام تو جب ہی ختم ہو گا جب ہماری زمین اور ہمارے سمندر کی تہہ سے تیل کا آخری قطرہ تک کھینچ کر نہیں نکال لیا جاتا۔[۲۱]

مختصر یہ کہ العاصفہ میں حسن منظر غیر ملکی آئل کمپنیوں کے ملازمین کو عرب ممالک کے روایات و اقدار میں تبدیلی کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب ممالک میں غیر ملکی لوگوں کی اجارہ داری ایک نہ ایک دن عرب ممالک پر مکمل طور پر قبضہ جمالے گی۔ اور یہ عرب ممالک جو تیل کے نام پر جی رہے ہیں۔ غیر ملکی تیل کا آخری قطرہ تک عرب ممالک سے چھین لیں گے۔ اس لیے عرب ممالک کو چاہیے کہ اپنی بقااور روایات و اقدار کی حفاظت کے لیے یکجا ہو کر کام کریں۔ اس کے علاوہ حسن منظر کے فن پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ معاشرے کے گہرے نبض شناس ہیں۔ اور انسان کی تمام تر ترجیحات سے واقف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں کے مکالمے حقیقت پر مبنی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی گفتگو سے قاری کے سامنے مصنف کے خیالات واضح ہو جاتے ہیں۔ ناول العاصفہ میں حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں سماج کے مسائل، غیر ملکی لوگوں کا قیام اور ان کے مقاصد کو منظر عام پر لانا ہی حسن منظر کا خاص نقطہ نظر رہا ہے اور وہ ناول میں ان مسائل کو بیان کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

حسن منظر کے ناول انسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن بھی اقدار کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ تلمیذ الرحمن کے کردار میں تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا سبب نیپی پور سے راجدھانی کی جانے والی ترک سکونت ہے۔ جہاں راجدھانی میں بڑی آپا اور بہنوئی کا سلوک، سماجی حالات تلمیذ الرحمن کے کردار میں اصلاح کے بجائے اس کی شخصیت میں مزید بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ بہنوئی کی ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ، بہن کا کھانے پینے میں اپنے بچوں کو فوقیت دینا اور تلمیذ الرحمن کو بس دو وقت کا کھانا دینا جس میں دو بسکٹ اور ایک کپ چائے شامل ہے۔ جیسے واقعات تلمیذ الرحمن کو جوئے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اور وہ جوئے سے پیسہ کما کر اپنے پیٹ کی بھوک کو ختم کرتا ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد بہن اور بہنوئی کا تلمیذ الرحمن کو گھر سے نکال دینا، اس کے کردار میں اپنے سگے رشتوں سے تنگ دلی اور بے اعتنائی کو ظاہر کرتا ہیں۔

انسان، اے انسان میں دوسری ترک سکونت تلمیذ الرحمن کی راجدھانی سے فلم کیپٹل سٹی تک کی ہے، جہاں اس کا دوست ایمن اسے بلاتا ہے۔ تلمیذ الرحمن فلم انڈسٹری میں چھوٹے موٹے کام کرتا ہے اور اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی دوران تلمیذ الرحمن کو دل آرا نامی اداکارہ سے محبت ہو جاتی ہے جو پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہے۔ تلمیذ الرحمن کی یہ محبت خاموش محبت ہی رہتی ہے۔ کیونکہ دل آرا اپنے شوہر کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔ تلمیذ الرحمن کی اپنے سگے رشتوں سے دوری، بے اعتباری اور بے دلی کی کیفیات اسے طوائفوں، فلم کیپٹل سٹی اور دیگر نچلے پست طبقے کے لوگوں سے ملواتی ہیں۔ جہاں اس کی زندگی مزید احساس گناہ اور احساس محرومی میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ وہ شراب، شباب اور جوئے کا عادی بن جاتا ہے۔ یہاں پست طبقے کے لوگوں سے دوستی اور گھر والوں کا سلوک تلمیذ الرحمن کے کردار میں اخلاقی اقدار کی زوال پذیری کا سبب بنتا ہے۔

> ان دنوں تلمیذ کی ڈور ایمن کے ہاتھ میں تھی اور ایمن کی آوارہ گردی کے۔ ایک دن وہ تلمیذ کو ایک کلب میں لے گیا جہاں میز پر بوتل تھی اور اتنے گلاس جتنے پینے والے۔ اس نے میز پر بیٹھنے کے بعد تلمیذ کو کہنی ماری اور بھوئیں ایک عورت کی سمت اچکائیں۔ جیسے پوچھ رہا ہوں پہچانو کون ہے۔۔۔ سائیلنٹ فلموں کی ہیروئین۔۔۔۔ اس کی میز پر بھی سب پی رہے تھے۔ وہ بھی پیئے ہوئے تھی، سگریٹ لرز رہا تھا۔۔۔۔ دو، تین بیئر چڑھانے کے بعد جب تلمیذ مثانہ خالی کرنے گیا تو وہ وہاں کھڑی تھی۔ ہاتھ میں شلوار کا کمر بند تھا۔ بولی۔ ادھر آ۔۔[۲۲]

فلم کیپٹل سٹی میں قیام کے دوران ہی تقسیم برصغیر پاک و ہند کے فسادات کا دور شروع ہوتا ہے۔ فلم سٹی سے نکالے جانے کے بعد تلمیذ الرحمن برٹش فوج میں بھرتی ہوتا ہے جہاں برٹش فوج اسے دوبارہ پرانی راجدھانی میں ایک سپاہی تعینات کر دیتے ہیں۔ ملک کے بگڑتے حالات اور فسادات کو دیکھتے ہوئے تلمیذ وہاں سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نئے ملک پاکستان آ جاتا ہے۔ یہاں تلمیذ الرحمن کی ملاقات غیور، مرتضیٰ، مسرور بیگ اور شان الٰہی جیسے کرداروں سے ہوتی ہے۔ جو اپنے اپنے عہدوں پر ناجائز اور کرپشن کے کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔

ناول انسان ،اے انسان میں غیور کا کردار ایک جرنلسٹ، مرتضیٰ کا کردار ایک وکیل، مسرور بیگ کا کردار پریس لیگ جبکہ شان الٰہی کا کردار ایک کلرک کا دکھایا گیا ہے۔ ناول انسان ، اے انسان میں ان کرداروں کے ذریعے سے حسن منظر نے پاکستان کے اس دور کی عکاسی کی ہے جب پاکستان کا قیام ہوا اور ان کرداروں نے کرپشن، ناجائز لوٹ مار، خود غرضی اور بلیک میلنگ کی وجہ سے پاکستان کو کھوکھلا کر دیا۔ ان کرداروں کے بارے میں تلمیذ اپنے کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

غیور جرنلسٹ، شان الٰہی ہیڈ کلرک، مسرور بیگ ضابطہ پریس کا مالک! میری سمجھ ہی میں نہیں آیا میں کن درندوں کے نرغے میں ہوں۔ جیسے شیر کے شکار کے لئے یہ درندے مجھے چارے کی طرح استعمال کر رہے تھے اور میں خوش تھا۔ اس سے پہلے نہ میں نے اس ہیڈ کلرک کی شکل دیکھی تھی، نہ مسرور بیگ کی۔ تعجب کی بات ہے ایک کرپٹ آدمی جس کے لیے سب کچھ جائز ہے کیسے پتہ لگا لیتا ہے اس کے کرپشن میں وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جس نے یہ کام پہلے نہ کیا ہو اور راز کو راز رکھے گا؟ بیس تیس لاکھ کی آبادی کے شہر میں جو پیسہ بنانے کی پروجیکٹ اس نے سوچی ہے۔ اسے پورا کرنے میں کون کون اس کا ساتھی بن سکتا ہے۔ یا کروڑوں کی آبادی کے ملک میں کتنے افراد مل کر ایسا کام خاموشی سے کر سکتے ہیں۔[۲۳]

تلمیذ الرحمن کی ان جرائم پیشہ افراد سے دوستی اسے جیل کی سلاخوں میں قید کرا دیتی ہے۔ جب کہ یہ دیگر کردار اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے معاشرے میں وہی جرائم دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ تلمیذ کو جیل سے باہر نکلنے میں اس کا دوست اور رکھیل امینہ مدد کرتے ہیں۔ جیل سے باہر آنے کے بعد تلمیذ الرحمن کی حالات زندگی میں بہتری آتی ہے تو وہ میمونہ نامی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی کے کچھ سال اطمینان اور سکون بھرے گزرتے ہیں لیکن پھر ملک کی بگڑتی معاشی صورتحال تلمیذ کے کردار کو واپس جوئے کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ وہ بیوی اور بچوں پر تشدد کرتا ہے۔ جوئے کے دوستوں کو گھر لے آنا، شراب اور قحبہ خانے اس کے کردار کا دیوالیہ بنا دیتے ہیں ۔ تلمیذ کے اسی سلوک سے تنگ آکر اس کا بیٹا نجم گھر چھوڑ دیتا ہے اور منشیات فروشی کا کام کرتا ہے۔ ایک دن نجم کے موت کی خبر گھر آتی ہے۔ میمونہ اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار تلمیذ کو ٹھہرتی ہے اور ایسی حالات زندگی سے تنگ آکر تلمیذ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہتی ہیں

میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی ہوں۔ مار کھانے میں مجھے عذر نہیں ہے کیونکہ یہ عورت کا فرض ہوتا ہے جس کا شوہر پی کر گھر آتا ہو اور سمجھ نہ سکتا ہو، جو ظلم وہ بچوں کے سامنے کر رہا ہے اس کا اثر ان کی جانوں پر کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی ان بچیوں کا مستقبل باپ کا سایہ پڑنے سے داغدار ہو ۔ اچھا ہوا بیٹا یہ دن دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے اٹھا گیا۔[۲۴]

میمونہ کے چھوڑ جانے سے تلمیذ کا کردار مزید ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول انسان، اے انسان کی کہانی کو منصف نے مرکزی کردار تلمیذ الرحمن کے جیل میں ماضی کی یادوں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ جو جیل میں جب اپنی ماضی اور حال کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے تو پشیماں ہو جاتا ہے۔ حسن منظر معاشرے میں موجود

انسانی زندگی کے مسائل کو سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں موجود واقعات انسانی زندگیوں کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حسن منظر کے ناولوں میں تاریخی واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے جو کسی بھی قوم یا ملک کی تہذیب و ثقافت سے آگاہی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انہی تاریخی واقعات کی وجہ سے ہی قاری اس دور کی تہذیب و ثقافت، معاشرتی حالات، اس دور کے لوگوں کے نظریات اور اعتقادات کو ناول کے کرداروں کے ذریعے سے جان جاتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حسن منظر کے ناول حبس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں حسن منظر نے ۱۹۴۸ء میں مغربی استعمار کے ہاتھوں نقل مکانی پر مجبور کئے گئے فلسطینیوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اسی ناول میں انہوں نے اسرائیل کی تاریخ، سیاسی نظام اور یہودیوں کے نظریات و اعتقادات کو بھی مختلف آوازوں اور کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

ناول حبس میں انہی آوازوں اور کرداروں کے ذریعے سے حسن منظر نے اس دور کی سیاسی و معاشرتی نظام کو نہ صرف بیان کیا ہے۔ بلکہ ان کی شاہانہ زندگی، رہن سہن، کھانے پینے کے طریقے، زبان، لباس اور کلچر کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس کی مثال ناول کے مرکزی کردار ایرک شیرون میں دیکھی جا سکتی ہے جو اپنی شاہانہ زندگی، عادات و اطوار، گفتار اور کھانے پینے کے طریقے سے یہودی کلچر کا نمائندہ دکھائی دیتا ہے۔

> باریک بالوں اور بھوری آنکھوں والا خدا کا منکر لیکن یہودی، روسی ماں باپ کا بیٹا۔ اسے اس کے دوست ایرک کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے اپنے پرائے سب کے لیے وہ بلڈوزر ہے اس سے بہتر ثانوی نام اس جسامت کے آدمی کے لیے جس کی خو بلڈنگوں کو ڈھانے اور بستی بے خبر آبادیوں کو کچل ڈالنے کی تھی۔۔۔۔ بھاری کھانے یعنی rich food رندی اور سگار کشی اس جسامت کا راز تھا ۔ کھانوں میں سفید گوشت شامل ہے جو قابل قبول دوسرا نام ہے اس گوشت کے لیے جس کا کھانا یہودیوں کے لیے اتنا ہی منع ہے جتنا مسلمان کے لیے۔[۲۵]

فلسطین کی سرزمین نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ تہذیب اور ثقافت کی امین بھی ہے۔ اسرائیل کے ناحق قبضے کی وجہ سے یہاں پر بے پناہ یہودی لوگ آباد ہوئے اور ابھی تک آباد ہیں۔ ان زائیونسٹ کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ کسی بھی طرح فلسطینیوں کو ان کی ہی سرزمین سے نکال باہر کرنا۔ اس کے لیے یہ زائیونسٹ ہر قسم کا جائز اور ناجائز حربہ استعمال کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سرزمین مسلمان کی تاریخ و تہذیب کی

صدیوں پرانی امین ہے اور اللہ پاک کا اس سرزمین پر کرم بھی ہے جو اس دھرتی پر اب بھی فلسطینی آباد ہیں اور محدود وسائل ہونے کے باوجود اپنی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔

حبس میں ایرک کا کردار بھی اپنی تہذیبی و مذہبی اقدار کی شکست وریخت سے خوفزدہ نظر آتا ہے۔ ناول کی تھیم سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ حسن منظر نے فلسطین ملک میں اسرائیل کے قبضے اور مغربی استعماروں کی سیاسی و معاشی اور معاشرتی برائیوں کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ ناول کی کہانی ایرک کی زبانی اسرائیل کے باسیوں اور دیگر استعماروں کو اخلاقی پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے ڈوبا ہوا دکھاتی ہے۔ اخلاق اور جذبات سے عاری مغربی ممالک پر منصف نے کڑی تنقید کی ہے، یہی نہیں حسن منظر نے ایک ایسے ملک کی ٹوٹ پھوٹ کو ناول میں بیان کیا جو بے بس فلسطینیوں کو نہ صرف مار رہے ہیں بلکہ ان کے ملک پر قابض بھی ہیں۔ ان لوگوں کے رویوں میں خوف، دہشت واضح طور دکھائی دیتی ہے جو انہوں نے ۱۹۰۵ء میں نازی حکومت کے ہاتھوں سہی۔ ان زائیونسٹ کو یہ خوف بھی لاحق ہے کہ یہ ملک فلسطین جن پر ہم ناحق قابض ہیں ہمارا نہیں رہے گا۔ حسن منظر نے ناول حبس کے انتساب میں ہی یہ لکھا ہے کہ:

> انہیں جتنا یقین اگلے دن سورج کے نکلنے کا ہے۔ اتنا ہی اس کا بھی کہ اس جنگ کا انجام بھی آغاز کے دن ہی لکھ دیا گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح غاصب اور استعمار کی شکست۔ خود میں ہوں، نہ ہوں مجھے بھی اگلے دن سورج نکلنے کا یقین ہے اور سامراج کی پسپائی کا۔[۲۲]

حسن منظر کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع اور باریک بین ہے۔ انہوں نے اپنی افتادِ طبع کی بدولت زبان میں نئی نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے مذہبی کتب مثلاً توریت، زبور اور انجیل کا وسیع مطالعہ بھی کیا ہے اور ان مذہبی کتب سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ یوں ناول میں ان مذہبی کتب سے واقعات اور حوالے پڑھتے ہوئے قاری کو اس عہد کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً اس عہد کے سیاسی و سماجی اور مذہبی مسائل کیا تھے۔ اس عہد میں کون سے واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ اور اس دور کے لوگوں کا رہن سہن، رسم و رواج کا بیان بھی حسن منظر کے ناول میں صاف دیکھنے کو ملتا ہے۔

ناول حبس میں حسن منظر کا انداز معلوماتی ہے۔ وہ پہلے ہر شے کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ پھر ہی بات کو آگے بڑھاتے ہیں، تاکہ قاری کو پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔ ناول کی زبان میں منصف کے معلوماتی انداز کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہولو کاسٹ (یونانی) مکمل تباہی اور خوں ریزی خاص طور سے جس میں شہری مارے جائیں
۔استعمال میں فاشسٹ جرمنی میں یہودیوں، کیمونسٹوں اور ذہنی معذوروں کی بڑی پیانے پر ہلاک
۔shoahاس کے لیے ایک نئی اصطلاح ہے جو ۱۹۶۷ میں وضع کی گئی۔[۲۲]

منصف کو انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے انہوں نے اپنے ناولوں میں انگریزی زبان کے الفاظ کو بڑے احسن طریقے سے برتا ہے۔ ناول پڑھتے وقت قاری کو کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ منصف نے شعوری طور پر انگریزی زبان کے لفظوں کو متن کا حصہ بنایا ہے۔ حسن منظر نے انگریزی الفاظ کو ہو بہو بھی اور اردو رسم الخط میں بھی ناول کی زبان کا حصہ بنایا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری کی نظروں سے بارہا ایسے الفاظ گزرتے ہیں جو اردو اور انگریزی دونوں رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ ناول میں سے اقتباس ذیل ہے۔" میرے اندر تھوڑا بہت جوڈایزم (Judaism) زندہ ہے۔" اس کے علاوہ ناول میں انگریزی الفاظ کو اردو میں یوں لکھا گیا ہے۔

ڈوکٹر، کورٹ، فٹ بال، کوفی، پورٹریٹ، وائرسس، مائکروبس، اینٹی بائیوٹک، کنٹرول، ڈالر، کیلنڈر، کمنٹری، پلسٹل، رائفل، ہینڈ گرینیڈز، اینگزائیٹی، ملٹری ڈیوٹی، الیکٹرانک پاور ہاؤس، ای۔ ای۔ جی۔ ایم۔ آر، ڈریس، او کسیجن ٹیوبس، ہوسپٹل، یو، ایس سیکرٹری اوف اسٹیٹ، پرفیکٹ، سیکورٹی کاؤنسل، پرائم منسٹر، کمپچر، پرفیوم، ٹیلی-ویژن، فزیوتھراپی، پلے رائٹ، میڈیسن۔ ہولوکاسٹ، جرنلسٹ، پاؤنڈ، انٹیلی جنس سروس، فوٹوگرافی، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، کیمرا، فائرنگ، لاؤڈ-اسپیکر، اسٹاف، سائکالوجیسٹ، سیل، فلیش بیک۔

حسن منظر کے فن کی عمدہ خوبی ہے کہ انہوں نے انگریزی الفاظ کو اردو رسم الخط میں استعمال کیا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے ناول حبس میں دیگر ممالک کی زبانوں کے الفاظ کو اردو رسم الخط کے علاوہ دیگر ممالک کی زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں استعمال میں لایا ہے۔ منصف کو زباں و بیان پر قدرت حاصل ہے وہ مختلف زبانوں کے جملوں اور لفظوں کو بڑی روانی سے اپنی تحریروں میں برتتے ہیں۔ اور ان کے معنی و مفاہیم بھی حاشیہ میں لکھ دیتے ہیں تا کہ قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

حسن منظر نے ناول ماں بیٹی کے کرداروں کو معاشرے میں اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی زوال پذیری کی علامتیں بنا کر پیش کیا ہے۔ منصف نے ناول کی کہانی میں دکھایا ہے کہ معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی وجہ سے ہی معاشرتی نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ ماں بیٹی میں حسن منظر نے اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کو ایک عورت کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے، جس کو معاشرے میں موجود مردوں کا طبقہ ذہنی و جسمانی

استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔ناول میں موجود ایسے مردوں کے کردار معاشرے میں اخلاقی و تہذیبی اقدار کی دھجیاں اڑاتے نظر آتے ہیں۔

اس ناول ماں بیٹی کی کہانی دراصل تین نسلوں کی زندگیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ناول میں منصف نے پہلی دو نسلوں کی کہانی مرکزی کردار کلیرس کی زبانی بتائی ہے۔ پہلی نسل میں کلیرس کی نانی کی کہانی مختصراً بیان کی گئی ہے۔کلیرس کی نانی جس کا نام میری ہے ان کی شادی ایک عیسائی پٹھان چارلس سے ہوتی ہے۔ چارلس بغیر کوئی ذریعہ آمدنی چھوڑے جلد ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو پیچھے میری اور اس کی بیٹی ڈیفنی کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے مختلف گھروں کے کام کرنے پڑتے ہیں۔

دوسری نسل میں منصف نے کلیرس کی ماں ڈیفنی کی کہانی کو بیان کیا ہے جو اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہوئے لوگوں کے گھروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اسی دوران انہیں ایک انجنیئر مارٹن کے گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔مارٹن ڈیفنی سے محبت اور شادی کے وعدے کرتے ہوئے ناجائز تعلقات استوار کرتا ہے اور ایک دن کام کا کہتے ہوئے بیرون ملک چلا جاتا ہے۔

تیسری نسل میں مرکزی کردار کلیرس کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کہ اپنی ماں کے مذہب کرسچین کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ ناول میں موجود یہ کردار اپنی ذات میں ایک خلا اور ادھورے پن کو محسوس کرتا رہتا ہے ۔کلیرس کا کردار اپنی ذات میں ادھورے پن کی تکمیل کے لیے مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اسی دوران کلیرس کی ملاقات حمزہ نامی لڑکے سے ہوتی ہے جو اسے مذہب اسلام قبول کرانے کے بعد خود سے شادی کرنے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ شادی کے چند عرصے بعد کلیرس پر یہ راز فاش ہوتا ہے کہ حمزہ جو بظاہر ایک نیک نامی شخص کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ ویسا نہیں ہے جیسا خود کو ظاہر کرتا ہے۔وہ غیر عورتوں سے تعلقات قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی بھی کرتا ہے۔یہی نہیں وہ کلیرس کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بناتا رہتا ہے۔ناول کی کہانی میں یہاں سے کلیرس کے کردار میں معاشرتی تصادم کا رویہ جنم لیتا ہے۔

کلیرس مذہب اسلام قبول کر لینے بعد ایک وفاشعار اور عبادت گزار بیوی بن کر رہنا چاہتی ہے۔ لیکن حمزہ کو عبادت گزار بیوی نہیں چاہیے ۔بلکہ اسے ایک ایسی بیوی چاہیے جو شوہر کے مزاج کے مطابق خود ڈھالنے اور جسمانی لطف کے نت نئے تجربات دینے میں اس کا ساتھ دے سکے۔گھر کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ اسے عزت دینے کے بجائے کم ہمت، عبادت گزار، ست الوجود ہونے کے طعنہ دیتا ہے۔ حمزہ کا کلیرس کے ساتھ سلوک اسے

مردوں سے خوف اور ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ناول میں کلیرس اپنی ازدواجی زندگی کا ذکر جیور جیانا سے یوں کرتی ہے۔

> میں نے بہت جلد مان لیا تھا، وہ پیتا ہے اور اسلام سے اس کی محبت مجھے حاصل کر لینے کے لیے تھی، اس میں گہرائی نہیں تھی۔ اکثر مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی اور عورت کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آگیا ہے۔۔۔۔اسے میرا نماز پڑھنا پسند نہیں تھا، بالخصوص صبح اور رات کی۔ وہ قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔۔۔۔اس نے مجھ سے کہا تھا، یہ تم کیا صبح شام فرش پر ٹکریں مارا کرتی ہو۔ میرے منھ سے نکلا، اسے تم ٹکریں مارنا کہتے ہو، یہ سجدے ہی ہیں جو انسان کو انسان بنائے رکھتے ہیں ورنہ وہ فرعون بن جائے۔۔۔اس نے مجھے پہلے بار گالی دے کر کہا۔ اب اگر ٹکریں مارتے دیکھا تو اتنے زور تمہارا سر زمین سے ٹکراؤں گا کہ پھٹ جائے گا۔[۲۸]

ناول ماں بیٹی میں کلیرس کا کردار ایک ایسی عورت کی نمائندگی کرتے دکھایا گیا ہے جو اپنے کرسچن مذہب اور معاشرے سے بغاوت کرتا ہے۔ مذہب اسلام کو اپناتے ہوئے ایک سادہ اور پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی میں ناکامی اور شوہر کے مرجانے کے بعد کلیرس کا کردار زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرے اور گھر کے تنگ حالات کلیرس کی زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ کرسچن کمیونٹی چاہتی ہے کہ کلیرس اپنی روایات و اقدار، مذہب کو واپس قبول کر لے۔ تب ہی کمیونٹی والے کلیرس اور اس کی بیٹی جیورجیانا کی ذمہ داری لیں گے۔

ماں بیٹی میں کلیرس کا کردار گھر کی اور جیورجیانا کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ اسی دوران کلیرس کی ملاقات ایک فتحیاب نامی شخص سے ہوتی ہے۔ جو اسے حمزہ کی پنشن لانے کا یقین دلاتا ہے اور اس کے لیے وہ کلیرس کے جسم تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں کلیرس کا کردار زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی تمام مذہبی اور اخلاقی روایات کو بھلا کر فتحیاب سے ناجائز تعلقات استوار کر لیتا ہے۔

یہ کردار جس کلچر میں رہائش پذیر ہے وہاں نہ تو مذہب اور نہ ہی وہاں کا معاشرہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ غیر مردوں سے تعلقات بنائے۔ لیکن کلیرس کا کردار اپنی گھریلو ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے جب اپنی مذہبی حدود کو پھلانگ کر فتحیاب سے ناجائز رشتہ قائم کرتا ہے تو ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی اذیت کلیرس کے کردار میں اپنے مذہب سے دوری کی وجہ بنتی ہے۔

ہر شخص زندگی میں کبھی نہ کبھی خود سے مصالحت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی آہستہ آہستہ فتح میرے گھر کا تیسرا فرد بن گیا۔ اس کی وجہ سے ضرورت کی جو چیزیں بک گئی تھیں پھر آنے لگیں۔ نئے میٹریس، تکیے، چادریں، غلاف، کھانے اور چائے کے برتن اور ناشتے کے لیے فروٹ جوس کے کارٹن، پنیر اور اوٹس۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی پریکٹس جہاں تھی، بہت کامیاب تھی۔۔۔ ان دنوں میں نے نماز چھوڑ دی تھی کیوں کہ میں خدا کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔[۲۹]

ناول ماں بیٹی کی کہانی میں منصف نے کلیرس کی ذات میں ہونے والی شکست وریخت کو بیان کیا ہے کہ کس طرح شروع سے ہی عورت کے وجود کو معاشرے میں اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اسے بس جسمانی سکون کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ محبت کے نام پر عورتوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور جب معاشرے میں عورت کو معاشی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو فتحیاب اور حمزہ جیسے مردان کا استعمال کرنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔

حسن منظر نے ناول ماں بیٹی میں مسلم مردوں کے ایسے کرداروں کو تخلیق کیا ہے جو بظاہر دین دار اور خود کو انسانیت کے درجے پر فائز رکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہ کردار اخلاقی اور مذہبی اقدار کی دھجیاں اڑاتے پھر رہے ہیں۔ ان کرداروں میں منصف نے ایک کردار حمزہ کا تخلیق کیا ہے جو کہ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور پہلے سے شادی شدہ ہے۔

ناول میں حمزہ کا کردار کلیرس کی خوبصورتی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے وجود تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ کلیرس کو مذہب اسلام قبول کروانے میں مدد کرنے کے ساتھ ساتھ خود سے شادی کر لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ کردار عیاش طبیعت کا مالک دکھایا گیا ہے۔ جو ایک رات غیر عورت کو گھر لے آتا ہے۔ کلیرس کے سمجھنے کے باوجود حمزہ اس کی ذات، کردار اور خاندان پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ "تم ٹکے ٹکے کی عورتوں، کوئی چیز تمہارے یہاں بھی ہے! you are cultureless people.۔"[۳۰]

ناول ماں بیٹی میں حمزہ کا کردار تہذیب اور اخلاق سے گرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ناول میں فتحیاب کا کردار بھی کلیرس کی زندگی میں پنشن میں مدد دینے کے لیے آتا ہے لیکن اس کا مقصد بھی کلیرس کے جسم تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ معاشرے کے ایسے کرداروں اور رویوں سے خوف زدہ ہو کر ہی کلیرس ترک سکونت

اختیار کرتی ہے۔ حسن منظر کے ناول ماں بیٹی میں یہ مسلم کردار ایسے افعال کو اپنائے ہوئے ہیں جن کی مذہب اسلام اجازت نہیں دیتا ہے۔ یوں یہ کردار معاشرے میں اخلاقی و تہذیبی اقدار کے زوال کا سبب بنتے ہیں۔

حسن منظر نے ناول میں ایسے نو مسلم کردار کو موضوع بنایا ہے۔ جسے مذہبی اور تہذیبی حوالے سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کلیرس کا کردار چونکہ عیسائی مذہب کو چھوڑ کر مسلمان بنتا ہے۔ مسلمان ہو جانے کے باوجود کلیرس کا کردار عیسائی کلچر کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوئے کلیرس کا کردار دو تہذیبوں کے ساتھ رہنے کے نتیجے میں اخذ و انجذاب کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ ناول میں اس کیفیت کا اظہار کلیرس کے کردار میں یوں دیکھنے کو ملتا ہے۔

> بے اختیاری میں سالوں بعد کلیرس کا ہاتھ سینے تک آیا۔ ایک بار اوپر سے نیچے تک گیا اور جب وہ اس خیالی لائن کو کروس کرنے کے لیے الٹی چھاتی تک گیا تو اس نے ہاتھ کو جھٹک کر خود سے علاحدہ کر دیا۔ For God's sake Georgi, do not give me blasphemous ideas. I am not that sinful۔۔۔(بے حرمتی کے خیالات جیورجی خدا کے لیے میرے دماغ میں مت بھرو۔ میں اتنی گنہگار نہیں ہوں۔) جیورجیا ناشرمندہ ہو گئی۔[۲۳]

ناول ماں بیٹی کی کہانی میں حسن منظر نے عورتوں سے روا رکھے جانے والے جسمانی اور ذہنی استحصال کو موضوع بحث بنایا ہے۔ منصف کا کہنا ہے کہ مشرقی معاشرہ جس میں لوگ اپنی روایات، اقدار اور کلچر کو اہم جانتے تھے۔ اب وہاں اخلاقی اور تہذیبی قدریں زوال پذیر ہیں اور ان اخلاقی قدروں کی پستی کا سبب معاشرے میں موجود حمزہ اور فتحیاب جیسے مرد ہیں۔ جو اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے مذہبی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں۔ معاشرے میں انہی اقدار کے بحران کے باعث کلیرس کا کردار خوفزدہ دکھائی دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا ہے۔

تہذیبی و ثقافتی اقدار کی شکست و ریخت کے حوالے سے حسن منظر کا ناول بیر شیبا کی لڑکی بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں حسن منظر نے ملک اسرائیل کے اندر بالخصوص وہاں کے حالات وواقعات اور آب و ہوا کی عکاسی کی ہے۔ یہی نہیں انہوں نے اس خطے کے ایک علاقے کی جغرافیائی اور ثقافتی صورتحال تک قاری کی رسائی کو ممکن بنایا ہے۔ ناول میں معاشرے کی ناہمواریوں اور تباہیوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

بیر شیبا کی لڑکی کی کہانی کو منصف نے واحد متکلم کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ناول کے آغاز ہی میں راوی افریقہ کے ایک چھوٹے سے شہر اوکنیا میں حاضر سروس دکھایا گیا ہے۔ جب کہ ناول کا مرکزی کردار

ربیکا وہاں ایک نرس کے فرائض سر انجام دے رہا ہے۔ناول میں راوی ایک ایسے علاقے میں ڈاکٹر تعینات ہوتا ہے جہاں بنیادی ضروریات و سہولیات (بجلی، ٹیلی۔فون، ٹیلی ویژن، اور کچن کے گیس کا سلنڈر وغیرہ) میسر نہیں۔ایک ہی پیشے سے وابستگی پہلے راوی اور ربیکا کے کردار میں رسمی تعلقات کو قائم کرتی ہے۔پھر ناول میں راوی کی بیٹی کی پیدائش میں مدد ربیکا اور راوی کے کردار کو گہری دوستی میں بدل دیتے ہیں۔اور ربیکا اپنی زندگی کا ایک ایک واقعہ راوی کو سناتی چلی جاتی ہے۔

ناول میں منصف نے ربیکا کے کردار کے ذریعے سے اسرائیل کے علاقے کی تنزلی اور ابتری کو کہانی میں بیان کیا ہے۔ناول میں یہ کردار اپنے اخلاقیات اور روایات کی پاسداری کرنے میں ناکام ہے۔ماضی کی تلخ یادیں اسے ہمیشہ اذیت میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ہر لمحہ عدم تحفظ، مذہب سے دوری اور بے جڑ ہونے کا احساس اس کے کردار میں اقدار کی شکست وریخت کو ظاہر کرتا ہے۔اقدار کی شکست وریخت کی اسی کیفیت کا اظہار ربیکا راوی سے یوں کرتی ہے

۔

میرے adopted parents کی میرے اعتقاد کے بارے میں کوئی رائے نہیں تھی۔۔۔۔ان کے مذہب کے بارے میں جو چیز میرے اندر سرائیت کرتی جارہی تھی وہ ان کا کرسچین برتاؤ تھا۔ گھر میں اور گھر سے باہر۔۔۔۔اور میں خود کو بتاتی تھی کہ یہ چیز ہمارے ہاں یوں نہیں ہے۔یوں ہے۔یا ہم یوں نہیں ہیں۔یوں ہے۔بالخصوص ان کا خون کی continuity (تسلسل) کے بارے میں فکر نہ کرنا۔۔۔۔میں نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں پوچھا پلیٹ میں جو گوشت میرے سامنے ہے کوشیر ہے یا نون کوشیر۔کبھی کبھی میں خود بھی سور کی تلی یا جگر کا اسٹیو سب کے لیے پکانے لگی تھی۔[۳۲]

حسن منظر کے ناول ہیر شیبا کی لڑکی میں قاری دیگر ممالک کے کلچر سے بھی واقفیت حاصل کرتا رہتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ منصف نے ناول میں ان کرداروں کو موضوع بنایا ہے جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور اپنے اسی پیشے کی وجہ سے یہ کردار دیگر ممالک میں سکونت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ناول میں موجود یہ کردار جس علاقے یا ملک میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔وہاں کی تہذیب وثقافت کو بھی اپنی گفتگو کے ذریعے سے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔

نسل نو میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات:

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش ابتدا سے ہی اپنی قدروں کو اہم جانتا ہے۔ بیرون ملک رہتے ہوئے احمد بخش کے کردار میں تہذیبی کشمکش، اپنی روایات و اقدار سے دوری کا احساس اُس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جب اس کے ہاں بچے کی پیدائش ہونے لگتی ہے۔ تب احمد بخش کو ایک نئی فکر ستانے لگتی ہے کہ اس ملک جہاں وہ سکونت پذیر ہے وہاں کا آزادانہ ماحول، لادینیت، جنسی استحصال، کلچر کے مسائل اور ہر آئے دن تشدد کے واقعات جیسے معاشرے میں میرے بچے کیسے پرورش پائیں گے۔ یہی سوچیں احمد کو ذہنی اذیت میں مبتلا کیے رکھتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے بچوں آخر مستقبل کیا ہو گا؟ کلچر شاک جیسے معاشرے میں ان کی روایات، اقدار اور تہذیب کیا ہوں گی، وہ کون سی روایات اور اقدار کو اہم جانے گے۔ کیا وہ بھی ایک دن اس بیرون ملک جس کی اپنی کوئی روایات، اقدار، تہذیب نہیں ہے۔ جہاں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ وہی سب کچھ اپنائے گئے جو یہاں رائج ہے۔ یہ سب باتیں احمد بخش کو ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار بنا دیتی ہیں۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا کردار دیارِ غیر میں رہتے ہوئے نسل نو میں اپنی روایات، اقدار اور تہذیب کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیت سے دوچار ہے اور اپنی اس کیفیت کا برملا اظہار وہ اولا سے بھی کرتا ہے۔

> ایک دن احمد بخش نے اولا سے ڈرتے ڈرتے کہا، "لڑکا ہو یا لڑکی، تم اسے اس ماحول میں پالنا چاہو گی؟" اولا سن سی رہ گئی۔ یہ گھر، یہ شہر، خود وہ اور احمد بخش اس کے نزدیک بس اتنا ہی ماحول تھا جس میں وہ بچے کو لانے جا رہی تھی۔ پھر یہاں کے سوا کسی اور ماحول میں بچے کو پالنے نہ پالنے کا سوال کیا تھا۔ اس نے کہا، میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا کہیں اور کے لیے کوچ کرنے کا ارادہ ہے؟ نہیں ارادہ تو نہیں ہے۔ ڈرتا ہوں اس ماحول میں ہمارے بچے کا ذہنی مستقبل کیا ہو گا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو یہاں ہر آدمی کے ہاتھ میں گن ہے؟ احمد بخش نے ہاں میں سر ہلایا اور بولا: اور بھی کچھ اور ایک دن اس کے ہاتھ میں بھی گن ہو گی؟ نہیں، اور کچھ۔ میں دماغ پر زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہتی۔ وہ نہ میرے لیے اچھا ہے نہ اس کے لیے، اس نے پیٹ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔[۲۳]

امریکہ چونکہ لبرل ازم پر یقین رکھتا ہے۔ لبرل ازم سے مراد ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس کے رہنے والے افراد ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں، ان کے لئے اپنی روایات، اقدار، اپنی مٹی اور حب الوطنی سے وابستگی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ وہاں کے رہنے والے افراد خود کو کسی بھی خیال، مسلک اور مذہب سے وابستہ نہیں کر پاتے ہیں، بیرون ملک میں یہی آزادی یعنی لبرل ازم جدید معاشرے میں جارحیت کا سبب بنتی جا رہی ہے جو جنسی بے

راہ روی اور آئے دن تشدد کے واقعات کے فروغ کا باعث ہے اور اس کی وجہ سے بیرون ملک رہنے والے تارکین وطن نفسیاتی بیماریوں کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

مغربی ممالک میں مشینی زندگی اور جدید ٹیکنالوجی کی دنیا نے انسانی اقدار کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ یہ انسان کی اخلاقی و تہذیبی قدروں کے زوال کی وجہ بھی بن رہا ہے۔اس کی وجہ سے ہی انسان خود سے اور خود سے جوڑ رشتوں سے دور ہو رہا ہے۔یہ مشینی اقدار اور جدید ٹیکنالوجی کا بجا استعمال انسان کو تنہائی، مایوسی، تحفظات اور اکیلے پن کا شکار بن رہے ہیں۔اس کی ایک مثال ناول دھنی بخش کے بیٹے میں اولا کے کردار میں دیکھی جاسکتی ہے جو مغربی ممالک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے واقعات کی وجہ سے نفسیاتی و ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

بچوں کی پیدائش کے بعد اولا خاموش ہو جاتی ہے، وہ گھر جو احمد بخش اور اس کی بیوی اولا کو کبھی مکمل اور محبت سے بھرپور لگتا تھا اب وہاں اداسی، مایوسی اور پریشانی نے گھیرا کر رکھا ہے۔اولا کا ذہن اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں اور امریکہ میں بڑھتے جنسی تشدد کے واقعات کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔اولا مغربی ملک کے ماحول سے خوف زدہ ہو کر خود کو گھر میں قید کر لیتی ہے۔عدم تحفظ کا احساس ہی اولا کو اپنی ذات کے خول میں سمٹ دیتا ہے۔اولا کی ایسی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے احمد بخش اس ہسپتال میں داخل کروانا چاہتا تھا لیکن اولا وہاں جانے سے انکار کر دیتی ہے۔

> ڈاکٹر کے اصرار کے باوجود اولا بچوں کو چھوڑ کر ہسپتال نہیں جانا چاہتی تھی جہاں وہ جانتی تھی کہ اس کے ڈپریشن کو کتنے ہی رنگ دیئے جائیں گے۔اس نے کہا وہ لوگ پہلے تو مجھے کتنے ہی نفسیاتی ٹیسٹ دے ڈالیں گے۔۔۔۔۔۔جس مرد کے بارے میں اولا نے سالوں پہلے پڑھا تھا کہ سلسلہ وار عورتوں سے جبریہ فعل کے بعد وہ انھیں قتل کر دیتا ہے، لگتا تھا اس کے آس پاس ہے ۔۔۔۔۔۔جب وہ بہتر طریقے سے بات کر سکتی تھی تو احمد بخش سے کہتی تھی، وہ میری تاک میں ہے، کہہ رہا ہے، تم میری تھیں۔دوسرے مرد سے شادی کر کے تم نے مجھ سے بے وفائی کی ۔اب تمہاری سزا ریپ اور موت ہے۔۔۔۔۔دواؤں سے وہ سو جاتی تھی۔اٹھتی تو گھنٹے دو گھنٹے خاموش رہتی۔سیلی کے ہونٹوں پر انگلی پھرتی اور اسے سینے سے لگا لیتی جیسے اس کی زندگی کی طرف سے بھی اسے خطرہ ہو۔۔۔۔ہومر ماں کی حالت سے ڈرا ڈرا رہتا تھا، اس کے پاس نہیں جاتا تھا۔لیکن یہ سب کچھ تھا، پر اولا ہسپتال میں داخل ہونے کو تیار نہیں تھی۔[۲۳]

اولا کی یہی حالت دیکھتے ہوئے احمد بخش کو اپنی تنہائی اور آخرت کی فکر ستانے لگتی ہے کہ بیرون ملک میرے مر جانے کے بعد میرے وجود کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا۔ جس طرح مشرق میں مردہ کو نہلا کر، پاک صاف کر کے، خوشبو لگا کر دفنایا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں مشرقی روایات اور کلچر کا حصہ ہوتیں ہیں۔ احمد بخش کو یہ خیال ہی بے چین کیئے رکھتا ہے کہ بیرون ملک والے میرے مر جانے کے بعد مجھے نہلائیں گئے کہ نہیں۔ میری کوئی نماز جنازہ نہیں پڑھائے گا اور نہ ہی کوئی میری قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آیا کرے گا۔ یوں ناول دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا کردار امریکہ جیسے جدید ترقی یافتہ معاشرے میں موجود برائیوں اور وہاں درپیش مسائل کے بارے میں خود سے ہی طرح طرح کر سوالات کرتا رہتا ہے اور جب اسے انہی سوالات کے جوابات ملتے ہیں تو وہ ذہنی اذیت میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔

اپنی تہذیب، روایات اور اقدار سے دوری کا سامنا زیادہ تر ان غیر ملکی شہریت اختیار کرنے والے لوگوں کو کرنا پڑتا ہے جو اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک آباد ہوتے ہیں۔ بیرون ملک رہنے والے یہی تارکین وطن نہ صرف اپنی روایات واقدار، کلچر کو اپنائے رکھتے ہیں وہی ان کے دل میں یہ خواہش بھی موجود ہوتی ہے کہ ان کی آنے والی نسلیں جو بیرون ملک رہ رہی ہیں۔ وہ بھی ان کے آباؤ اجداد کی روایات واقدار کو اپنائے رکھیں لیکن جب تارکین وطن اپنی نسل میں اپنی آبائی روایات واقدار کو پروان چڑھتے نہیں دیکھتے تو ان کا اپنی روایات پر یقین ڈگمگانے لگتا ہے جس کی وجہ سے بیرون ملک تارکین وطن عدم تحفظ کا شکار ہو کر اپنی تشخص کھونے لگتے ہیں۔ حسن منظر کے ناول دھنی بخش کے بیٹے میں ہمیں ایسی صورتحال بارہا دیکھنے کو ملتی ہے جب احمد بخش کا کردار بیرون ملک رہتے ہوئے اپنی تہذیب وثقافت میں شکست وریخت کی کیفیت سے دوچار دکھائی دیتا ہے۔

مغربی ممالک میں روایات واقدار کی شکست وریخت اور نسل نو میں اپنی روایات کے حوالے سے رد وقبول کیفیت نے احمد بخش کو ذہنی اور جسمانی طور پر جھنجھوڑ کر رکھا دیا ہے۔ مشرق اور مغرب کا تضاد ہی اس کی سوچوں کو مہمیز کرتا ہے۔ احمد بخش کا کردار ہمہ وقت مشرقی اور مغربی معاشرے کی روایات، اقدار اور ان کے اپنے بچوں پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں غور فکر کرتا رہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ بیرون ملک میں رہتے ہوئے بھی اس کے بچے ہومر اور سیلی مشرقی قدردوں کو نہ صرف اہم جانیں بلکہ ان روایات واقدار کو اپنانا بھی شروع کریں، اس کے لیے احمد بخش اپنے بچوں کو مشرقی رہن سہن، روایات واقدار، خوراک، لباس اور کلچر کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

وہ بچوں کو کھانے کی میز پر گپ شپ کے انداز میں بتاتا رہتا تھا اس کے ملک کی تہذیب کیا ہے: اپنا حق چھوڑ دینا، ہاتھاپائی کو وہاں برا سمجھا جاتا ہے چہ جایکہ یہاں کے چہار حرفی الفاظ جو یہاں لوگوں کی زبانوں پر گھر میں بھی رہتے ہیں، کام کرنے کی جگہ پر بھی اور کوچہ و بازار میں بھی۔ ایک طرح سے وہ بچوں کو ان کے پیدائش کے ملک سے نفرت سکھارہا تھا اور اپنے پیدائش کے ملک سے جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں محبت۔ کبھی کبھی بچے پوچھ بیٹھے تھے، ہمارے ملک میں یہ چیز کس طرح ہے، یا ہمارے ملک میں بچے کون سا کھیل کھیلتے ہیں؟ ایک دن ہومر نے پہلی بار معصومیت سے پوچھا، "ڈیڈ ہمارے ہاں مچھلی کیسے کھاتے ہیں"؟ اس وقت اسے فش نائف اور کانٹے سے مچھلی کھانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اولا اور احمد بخش بھونچکارہ گئے۔ خاموشی کو توڑنے کے لیے اولا نے پوچھا، ہمارے یہاں سے کیا مطلب ہے؟ ہومر اور سیلی نے بیک وقت کہا، ڈیڈ کے یہاں، جہاں کے ہم ہیں۔ [۲۵]

احمد بخش کے کردار میں ذہنی خلفشار کا سبب مغربی ممالک میں لادینیت، بے جا آزادی اور کلچر شاک کے فروغ کے مسائل ہیں اور انہی سب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جارحیت نے اسے ذہنی و نفسیاتی انتشار کی طرف دھکیل دیا ہے۔ ذہنی و نفسیاتی انتشار کے باعث ہی فکری افراتفری احمد بخش کے وجود کا حصہ بن گئی ہے جو اسے مختلف خیالوں میں الجھے رکھتی ہے۔ بیرون ملک اپنے بیوی بچوں کا ساتھ ہونے کے باوجود احمد بخش کو تنہائی کا خوف ستاتا رہتا ہے، یہی نہیں احمد بخش کو بارہا ایسے خیالات آتے رہتے ہیں کہ اگر کبھی اولا نے مجھے چھوڑ دیا تو میرا کیا بنے گا، گاؤں والے تمسخر اڑاتے ہوئے کہیں گئے کہ گوری چھوڑ کر بھاگ گئی وغیرہ وغیرہ اور اگر کبھی بچوں کے بڑے ہو جانے پر انہوں نے مجھے اور اولا کو چھوڑ دیا تو وہ لوگ کیسے زندگی گزاریں گئے۔ یہ وہ خیالات ہیں جن کا ذکر احمد بخش چاہ کر بھی اولا یا اپنے کسی دوست سے نہیں کر پاتا ہے اور ان خیالات کی بدولت احمد بخش کو ذہنی دباؤ کا سامنا ہے، ناول میں احمد بخش اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے۔

ایک وہ وقت بھی آئے گا جب ہومر گھر سے نکل کھڑا ہو گا۔۔۔۔۔ ایسا ہی کچھ سیلی کرے گی، اپنے ٹروفرینڈ کو ایک شام گھر لے کر آئے گی اور اس وقت مجھے دھڑکا لگ جائے گا۔ تنہائی کا گجر میرے دماغ میں بجنے لگے گا۔۔۔ یہ وہ بات تھی جو احمد بخش نے اولا سے کبھی نہیں کہی تھی کہ صرف بچوں کا بڑے ہو کر یہاں کے رنگ میں رنگ جانا ہی سب کچھ نہیں ہے جس کی وجہ سے میں یہ ملک چھوڑنا چاہتا ہوں، اصل وجہ یہ ہے کہ میں تنہائی کی موت نہیں مرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ وہ جسم جسے اتنے سارے سینت کر رکھا، جو چند منٹوں میں مجھے استخواں اور گوشت اور پوست سے

ایک یا آدھ کلو سفید راکھ میں تبدیل کر دے۔ نہ نذر نہ نیاز۔ وہ اس قوم کی فرد نہیں ہے جس میں لوگ سوگ منانے کے لئے جیتے رہتے ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ کسی اور ملک کو چلی جائے، کسی بھی عمر میں شادی کر لے اس کے لیے اسٹاک ہوم لوٹ جانا کیا برا ہو گا، تمہاری تہذیب کی محبت کی نشانیاں کچھ اور ہیں اس کی تہذیب کی کچھ اور۔"[۳۲]

احمد بخش کے کردار میں اپنے ملک، مٹی، روایات و اقدار سے دوری ہی فکری انتشار کو جنم دیتی ہے اسی انتشار اور ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لیے احمد بخش اپنے کالج کے دوست کے پاس اسکاٹ لینڈ چلے جانے کا ارادہ کرتا ہے، تاکہ اس کا ذہن جو منفی سوچوں کا شکار ہے اور بیرون ملک کے کلچر سے بیزار، پریشان ہے، خود کو ان سب سے الگ رکھ کر کچھ ذہنی سکون حاصل کر سکے۔

احمد بخش جب اپنے دوست کے گھر اسکاٹ لینڈ جاتا ہے تو اسے اپنے اندر مزید تنہائی، مایوسی اور اکیلے پن کا احساس ستانے لگتا ہے۔ احمد بخش کے کردار میں اکیلے پن اور مایوسی کی وجہ مصور اور اس کی بیوی کا پاکستانی ہونا ہے۔ وہ دونوں اسکاٹ لینڈ جیسے ملک میں رہتے ہوئے بھی اپنی مٹی، روایات و اقدار اور کلچر کو نہ صرف اپنائے ہوئے ہیں بلکہ ان کے بچے بھی انہی روایات و اقدار پر عمل پیرا ہیں اور ایک مکمل، مطمئن اور خوشگوار زندگی جی رہے ہیں۔ احمد بخش اپنے دوست مصور کی ایسی زندگی دیکھتے ہوئے ان پر رشک کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر کبھی مصور کو اپنے بیوی بچوں سمیت پاکستان جا کر رہنا پڑے تو وہ وہاں بھی خوش اور مطمئن رہے گا اور ایک میں ہوں جو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ میں کون ہوں؟ کہاں کا ہوں؟ کس ملک کو اپنا کہوں؟ سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کئے رکھتا ہوں۔ انہی سب باتوں کے بارے میں سوچتے ہوئے احمد بخش فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ملک پاکستان ضرور جائے گا، یہاں سے ناول میں مشرقی تہذیب اور احمد بخش کے بھائی علی بخش کی دیہاتی زندگی سامنے آتی ہے۔

پاکستان آنے کے بعد احمد بخش یہ دیکھتا ہے کہ ملک اور گاؤں کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہی نہیں اس کا بھائی علی بخش بھی ویسے کا ویسا ہی ہے۔ ایک جاگیردار اور عورتوں کا دلدادہ۔ احمد بخش کو یہ دیکھ کر بھی نہایت دکھ ہوتا ہے کہ علی بخش کی پانچویں بیوی کی عمر اس کی اپنی بیٹی کے برابر ہے۔ ان سب حالات و واقعات سے دل برداشتہ ہو کر احمد بخش واپس بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ حسن منظر نے اپنے اس ناول کے کرداروں کے ذریعے سے مشرقی اور مغربی زندگیوں کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول کے مکالمے موقع محل اور کرداروں کی نفسیات کے عین

مطابق ہیں اور یہی نہیں انہوں نے ناولوں کے کرداروں کی تشکیل میں ندرت و تازگی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی سے بڑی حد تک کام لیا ہے اور یہ ان کے فن کی نمایاں خوبی ہے۔

نسل نو میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات ناول ماں بیٹی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ماں بیٹی میں کلیرس چونکہ کرسچین مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوتی ہے تو وہ مذہب اسلام کی طرح طرز زندگی، روایات و اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔اور چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی جیورجیانا بھی اسلامی روایات و اقدار کو نہ صرف اہم سمجھے بلکہ ان روایات و اقدار پر عمل پیرا بھی ہو۔ماں کی مذہبی میں تبدیلی جیورجیانا کے کردار میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات سے دوچار نظر آتا ہے۔

> اسے اکثر اپنی زندگی میں ایک پیانو کی کمی محسوس ہوتی تھی اور تلخی سے سوچتی تھی۔کاش مما نے زندگی نہ بدلی ہوتی تو میں چرچ میں پیانو بجانا سیکھ سکتی تھی۔۔۔۔۔۔ماں سے چپٹ کر بولی مما ڈیئر میں مسلمان ہوں یا کرسچین یہ تک مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔لیکن میں یہ جانتی ہوں اگر آپ دنیا میں کسی سے ملتی ہیں تو وہ، وہ میری ہے۔جس نے زخمی جیسس کو اپنے زانوؤں پر لٹار کھا ہے۔کاش میری کی کوئی بیٹی ہوتی تو میں سمجھتی، میں وہ ہوں۔[۲۷]

تارکین وطن میں اپنی نسل نو میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات ہی انہیں ذہنی و جسمانی ناآسودگی میں مبتلا کر دیتیں ہیں۔

تارکین وطن کا اپنے ملک اور بیرون ملک کا تقابل کرتے رہنا:

دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا کردار بیرون ملک ایک یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے مقرر ہوتا ہے تو وہ اپنے طلباء کو اپنے ملک کے بارے میں، وہاں کی روایات و اقدار، رہن سہن اور کلچر کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔یوں احمد بخش کا کردار بیرون ملک رہتے ہوئے بھی اپنی روایات و اقدار سے نہ صرف جڑا ہوتا ہے بلکہ انہیں اہم جانتا ہے اور اس کا ذہن شعوری طور پر دونوں ممالک کی تہذیب کا موازنہ کرتا رہتا ہے۔جس کا اظہار احمد بخش اکثر اپنی ورک شاپ میں یوں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> آنے والے دنوں میں اپنے یہاں کے دیہات کی زندگی کا ذکر اس نے بارہا اپنے پیشے سے متعلق ورک شاپس میں کیا اور کلاس میں بھی کہ "گو وہ سوسائٹی بیک ورڈ ہے لیکن وہاں آبادی اتنی گچھی ہوئی ہے کہ کوئی بے سہارا نہیں ہوتا ہے، نہ وہاں ہر وقت عورت کے سر پر طلاق یا علیحدگی کی تلوار لٹکتی رہتی ہے کہ ان کے بعد بھٹکتے پھرنا ہی اس کا مقدر ہوگا۔رہے گی بیوی اس سوسائٹی کے

اسی حصے میں رشتے داروں کے درمیان۔ نہ بیٹی کو بڑا ہوتے دیکھ کر انہیں یہ فکر ستاتی رہتی ہے کہ اسے کیسی سوسائٹی ملے گی، کیسا ماحول، اس کا کیا بنے گا۔ وہ دنیا کی بڑی سوسائٹی میں جو تا حد خیال پھیلی ہوئی ہے اس طرح تو گم نہیں ہو جائے گی (یہاں وہ امریکی فلموں اور ناولوں سے مثالیں دیتا تھا) کہ کوئی اس کو سیدھا راستہ بتانے والا نہ رہے اور وہ نہ کبھی کہیں دیکھنے میں آئے۔ نہ کسی کے سننے میں۔ یا بار بار طلاق یا علیحدگی کے بعد کہیں کسی اپارٹمنٹ میں تنہا تو رہتی ہوئی نہیں پائی جائے گی۔۔۔۔۔ یہاں اگر لڑکی نیویارک سے اپنے مائیکے میں جائے تو پتا چلے گا her people have moved out: (وہ لوگ وہاں سے جا چکے ہیں)۔[۴۸]

پاکستان آنے کے بعد احمد بخش یہ دیکھتا ہے کہ ملک اور گاؤں کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہی نہیں اس کا بھائی علی بخش بھی ویسے کا ویسا ہی ہے۔ ایک جاگیر دار اور عورتوں کا دلدادہ۔ احمد بخش کو یہ دیکھ کر بھی نہایت دکھ ہوتا ہے کہ علی بخش کی پانچویں بیوی کی عمر اس کی اپنی بیٹی کے برابر ہے۔ ان سب حالات و واقعات سے دل برداشتہ ہو کر احمد بخش واپس بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ حسن منظر نے اپنے اس ناول کے کرداروں کے ذریعے سے مشرقی اور مغربی زندگیوں کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول کے مکالمے موقع محل اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں اور یہی نہیں انہوں نے ناولوں کے کرداروں کی تشکیل میں ندرت و تازگی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی سے بڑی حد تک کام لیا ہے اور یہ ان کے فن کی نمایاں خوبی ہے۔

مختصر یہ کہ احمد بخش اپنے ملک کے حالات سے تنگ آ کر بیرون ملک سکونت اختیار کرتا ہے۔ ترک سکونت کا یہی عمل احمد بخش کے کردار میں اپنی روایات و اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کو نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے اثرات بھی سامنے لاتا ہے۔ بیرون ملک کی بے جا آزادی، کلچر شاک جیسے مسائل اس کے کردار میں روحانی و اخلاقی تنزلی کا سبب بنتے ہیں جو احمد بخش کو تنہائی، ذہنی ناآسودگی اور بے اطمینانی کا شکار کر دیتے ہیں۔

حسن منظر کا ناول انسان ، اے انسان میں تلمیذ الرحمن بھی ترک سکونت اختیار کر لینے کے بعد اپنے آبائی علاقے اور نئے علاقے کا موازنہ کرتے رہتا ہے۔ انسان ، اے انسان سیاسی و سماجی پس منظر کا حامل ناول ہے۔ جس میں منصف نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی و سماجی حالات کو قلم بند کیا ہے۔ اس ناول میں منصف نے پاکستان کے قیام اور ملک میں کرپشن کے فروغ، مذہبی و جنسی مسائل اور اخلاقی و سماجی اقدار کی تنزلی جیسے مسائل کو کرداروں کے ذریعے سے نہ صرف منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان مسائل کے پیچھے کار فرما عوامل کو ہدف تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔

حسن منظر نے ناول انسان، اے انسان میں ایک ایسے شخص کی کہانی کو بیان کیا ہے جو تمام عمر ترک سکونت کے تجربے سے دو چار رہا اور اس کی زندگی لحہ بہ لحہ تبدیلیوں کا سبب بنتی رہی۔ منصف نے اس ناول کی کہانی کو بیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمن ہے۔ جو اپنی زندگی کے ہاتھوں بے بس اور مجبور دکھایا گیا ہے۔ ناول کی تمام کہانی اسی کردار کے گرد گھومتی ہے۔ حسن منظر نے ناول میں تلمیذ الرحمن کے بچپن سے لے کر موت تک کے واقعات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

ناول میں تلمیذ الرحمن کی پہلی ترک سکونت چھ سال کی عمر میں مینی پور سے راجدھانی کی ہے۔ جب اس کے گھر آئی ہوئی ایک بڑی عمر کی لڑکی تلمیذ الرحمن کو اپنے ساتھ جنسی تعلق کی طرف راغب کرتی ہے اور اسے خاموش رہنے کا کہتی ہے۔ تب تلمیذ الرحمن جان جاتا ہے کہ گناہ چھپ کر کرنے کی چیز ہے۔ اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر تلمیذ الرحمن ایک اور لڑکی کے ساتھ چھپ کر نازیبا حرکات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ لڑکی تلمیذ الرحمن کے والد سے اس کی شکایت کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے تلمیذ الرحمن کے والد اسے راجدھانی بڑی آپا کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

> باپ کے گھر گزارے ہوئے دنوں کی سب سے دردناک یاد جو تاعمر اس کے ذہن میں رہی۔ یہ تھی کہ اس دوسری بڑی عمر کی لڑکی کے، جس سے اس نے کہیں چھپ کر سینہ کھول کر دکھانے کو کہا تھا۔ راز اگل دینے نے اسے بڑی بہن کے گھر پہنچا دیا تھا۔[۳۹]

انسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن کا کردار ترک سکونت کے تجربے سے گزر کر جب نئی جگہ سکونت اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے علاقے اور میزبان علاقے کا موازنہ یوں کرتا دکھائی دیتا ہے

> راجدھانی بالکل نئی دنیا تھی۔ وہاں سڑکیں اتنی چوڑی تھیں کہ ان کے دونوں اطراف درخت تھے اور پھر چلنے والوں اور سواریوں کے لیے بیچ میں بہت سے جگہ تھی۔ یہی نہیں بعض سڑکوں میں گھڑ سواروں کے لیے علیحدہ راہداری تھی۔۔۔۔۔ وہاں پارک، سنیما گھر، ریسٹورنٹ اور ایسی دکانیں جن میں شراب بکتی ہے۔ کھلے عام! مینی پور کی طرح نہیں جہاں شراب پینے والے تھے لیکن شراب کی دکانیں نہیں تھیں۔ پالکیاں اور ڈولیاں نہیں تھیں۔[۴۰]

حسن منظر کے ناول حبس کی کہانی بیانیہ طرز کی ہے، جو ایرک کی یادداشتوں پر مبنی ہے اور اسی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ ناول میں ایرک کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کی وجہ سے اسے شیبا میڈیکل سینٹر منتقل کیا جاتا ہے، وہاں ہوش و حواس بجانہ ہونے پر یہ کردار گہری غنودگی میں گم دکھائی دیتا ہے۔ میڈیکل ٹیم ایرک کی آنکھوں میں ایک جھروکا رکھتے ہیں کہ شاید وہ دیکھ لے، سن لے یا پھر پلکیں جھپکا لے، پر ایسا ممکن نہیں ہوتا۔

ناول جس میں ایرک کا کردار شیبا میڈیکل سینٹر میں مسلسل محو خواب ہے۔ جہاں اس کا ذہن نازی حکومت کے ہاتھوں کئے جانے والے ظلم، قتل وغارت اور دربدری کے بعد فلسطین پر قبضے اور فلسطینی بچوں، بڑوں اور بوڑھوں سے روا رکھے جانے والے سلوک کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ ناول میں موجود دیگر کردار جن میں ہسپتال کا اسٹاف اور آوازیں شامل ہیں۔ ایرک کے کردار کو تقریباً آٹھ سال سے اسی درد، تکلیف اور اذیت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں جو اسے گہری غفلت میں ہونے کے باوجود بھی تنہا نہیں چھوڑتے ہیں۔ ناول میں نازی حکومت کی ستم ظریفی، فلسطینیوں کے ساتھ سلوک، برطانیہ اور امریکہ کا مل کر فلسطین کا ایک بہتر حصہ اسرائیل کو تحفے میں دینا، جیسے واقعات ایرک شیرون کے کردار کو تاریخ اور تہذیب سے جوڑے رکھتے ہیں۔ ایرک کا ذہن کوما میں ہونے کے باوجود مغربی استعماریت اور فلسطین آبسنے کے تقابل کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "کتنا خود کو خوش کرنے والا خیال ہے حب الوطنی کا۔ برطانیہ، فرانس، اور امریکا کو باور کرانے کے لیے کہ "تم نے ہمیں ایک ملک دیا اور ہم نے اسے اس میں بسنے والی قوم سے آزاد کرا لیا۔"(۴۱)

بیت المقدس یا فلسطین کی سرزمین اسلامی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے اہم درجہ رکھتی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں مسجد اقصیٰ قائم ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کا پہلا قبلہ اول ہونے کے ساتھ ساتھ اسی سرزمین پر بے پناہ انبیا کرام نازل ہوئے۔ اس لیے فلسطین کی سرزمین ہر مسلمان کے دل میں ایک اہم اور عظیم مقام رکھتی ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سرزمین عالمی طاقتوں کے لیے توجہ کا مرکز بن گئی۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو فلسطین کی سرزمین پر پہلے غیر مذہبی قومیں آباد تھیں۔ مسلمانوں نے جنگ کر کے اس ملک کو فتح کیا، پھر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد انگریز ممالک فلسطین پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں نازی حکومت کی ستم ظریفی کی وجہ سے کئی یہودیوں نے مختلف ممالک میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۱۷ء میں امریکہ اور برطانیہ نے مل کر یہودیوں کو در پردہ عربوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور یہ عذر پیش کیا کہ جہاں پر فلسطینی لوگ آباد ہیں وہ سرزمین دراصل تمہاری ہے، جہاں تمہارے آباؤ اجداد رہتے تھے۔ اس لیے یہودیوں کو اسی سرزمین میں اپنی حکمرانی کرنی چاہیئے۔ یوں وہ زائیونسٹ جو کبھی امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی استعماروں کو ناقابل قبول تھے۔ انہیں مغربی استعماریت نے یہ سرزمین تحفے میں دان کر دی۔

فلسطین کی سرزمین پر یہودیوں کو لا بسانے میں مغربی استعماریت کا مقصد یہ ہے کہ جو عرب لوگ صدیوں سے یکجا ہیں ان میں پھوٹ ڈالی جائے۔ اور یہودیوں کے ذریعے سے مسلمان ملکوں میں افرا تفری پھیلائی جائے۔ اس

طرح یہودی اور مسلمان آپس میں ہی دست گریباں رہے گے اور ہم مغربی استعماریت کو دنیا میں قائم رکھے رہیں گے ۔ناول میں ایرک مغربی استعماروں کے بارے میں کہتا ہے کہ۔

> ۱۹۰۵ء میں برطانیہ نے بدیشیوں کا ایکٹ Aliens Act پاس کیا تھا کہ روسی پوگروم کے بعد یہودی ان کے ہاں داخل نہ ہونے پائیں اور ۱۹۱۷ء میں بالفور برطانیہ کے وزیر خارجہ نے چاہا کہ تم ملکوں ملکوں بھٹکتے پھرنے والوں کہیں توبسو، توجو زمین اس کی نہیں تھی اسے اس کے مالک سے بلا پوچھے تمہیں دان دی گئی اور ۱۹۲۲ء میں اپنی سرپرستی میں برطانیہ نے تمہیں وہاں لا بٹھایا اور تمہارے سابقہ دشمنوں نے ۱۹۴۸ء میں اس زمین کا بڑا اور بہتر حصہ تمہارے حوالے کر دیا۔ پھر پیش قدمی کے طور پر کہ تم خوفزدہ ہو کر ایک بار پھر وہاں سے نہ نکل بھاگو سارا مغرب تمہارا محافظ بن بیٹھا، پہلے وزیر اعظم بین گوریوں نے برطانیہ کا شکریہ ادا کیا جس نے زائیون کی دہشت گرد تنظیموں کو ملٹری ٹریننگ دی اور فوراً ہی وہ سب اس پر آمادہ ہو گئے کہ اس تحویل میں لیے ہوئے ملک کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ کر برطانیہ وہاں سے نکل جائے ۔۔۔میرا دماغ چکی کر دیا ۔مارگالت اور للی تم کہاں ہو۔[۳۲]

زیر بحث ناول حبس میں منصف نے تقریباً تمام واقعات اور جگہیں حقیقی بتائی ہیں۔ حسن منظر نے اپنے کرداروں اور آوازوں کے ذریعے سے ان واقعات اور جگہوں کا نقشہ بہت باریک بینی سے کھنچا ہے۔ فلسطین کی تاریخ میں اہم ترین موڑ یہودیوں کو فلسطین میں رہنے کی اجازت دینا ہے۔ اسرائیل کا اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے فلسطینیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک اور اس کی تفصیل بھی حسن منظر نے مرکزی کردار اور آوازوں کی زبانی بتائی ہے۔

حسن منظر نے ناول ببیر شیبا کی لڑکی کی تھیم اس واقعہ کو بنایا ہے جسے ہولوکاسٹ کہتے ہیں۔ یہ ناول دراصل سیاسی اور مذہبی پس منظر کا حامل ناول ہے۔ جس میں یہودی لوگوں پر نازی حکومت کی قتل وغارت کے زمانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حسن منظر نے ناول میں ایک یہودی لڑکی کی حالت زار کا دردناک نقشہ پیش کیا ہے۔ جو نازی حکومت کی ستم ظریفی اور قتل وغارت کے سبب ایک کرسچین فیملی کو سونپ دی جاتی ہے۔ نازی حکومت کی ستم ظریفی ربیکا کے کردار کو ذہنی و جسمانی دونوں سطحوں پر متاثر کرتی ہے۔ پھر جنگ کے بعد کے سماجی حالات ربیکا کے کردار میں مایوسی، درد، کرب اور اذیت کا سبب بنتے ہیں۔

حسن منظر نے ناول کی کہانی کو ایسے تشکیل دیا ہے کہ قاری تجسس کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کی تہذیب اور تاریخ سے واقفیت حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ناول کے ہر باب کا اختتام منصف نے تجسس بھرے جملوں پر کیا ہے ۔جو ناول میں ایسی فضا کو قائم رکھے ہوئے ہے جس سے قاری میں اگلا باب پڑھنے کی لگن اور جستجو خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ہر باب اپنے ساتھ نئے اور دلچسپ واقعات لے کر قاری کے سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری آخری صفحے تک ناول کی کہانی جاننے کے لیے متوجہ رہتا ہے۔

حسن منظر مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں رہے۔ پھر ۱۹۴۷ء کی جبری نقل مکانی کی وجہ سے انہوں نے دیگر ممالک میں سکونت اختیار کی۔دیگر ممالک میں رہتے ہوئے حسن منظر نے وہاں کی تہذیب و ثقافت کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا بلکہ اس تہذیب و ثقافت میں بسنے والے اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے کرواروں کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ منظر صاحب کے تقریباً تمام ناول ہی اپنے کرداروں کے ذریعے سے اپنے اپنے مذہب اور کلچر کی نمائندگی کرتے ہوئے قاری کو اس مذہب یا کلچر سے بھرپور واقفیت دلاتے ہیں۔

حسن منظر اپنے ناولوں کے کرداروں کے ذریعے سے مختلف ممالک کے مذاہب اور کلچر سے قاری کو روشناس کرواتے ہیں۔وہ پاکستانی کرواروں کے ذریعے سے مشرقی تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہیں۔یہی نہیں ان کے کسی کردار کا تاریخی یا مذہبی واقعے سے وابستہ ہونا قاری کو ان تاریخی واقعات سے بھرپور واقفیت ولا جاتا ہے جو اپنے دور میں اہم تھیں۔یوں ان کے ناولوں کے کردار نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

حسن منظر ناولوں کے کرداروں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے کردار انسانی فطرت کے عین مطابق تخلیق کئے گئے ہیں۔جو اپنے معاشرے، طبقے اور اقدار کی حقیقی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔حسن منظر نے انسانی زندگیوں کی حقیقتوں کا نہ صرف وسیع مشاہدہ کیا ہے۔بلکہ وہ نفسیاتی مطالعے کے بعد ہی ایسے کرداروں کو ناولوں میں پیش کرتے ہے۔جو تخیلاتی زندگی سے نہیں بلکہ معاشرے سے ہی لیے گئے ہیں اور معاشرے کی حقیقی زندگی کا منظر پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ سید احمد دہلوی،فرہنگ آصفیہ ، جلد اول(لاہور: مطبع رفاہ عام پریس،۱۹۰۵ء)، ص ۹۱۴۔

۲۔وارث سرہندی،قاموس مترادفات(لاہور:کاروان پریس دربار مارکیٹ،۱۹۸۶ء)ص ۴۲۷۔

۳۔اردو لغت (تاریخی اصول پر)

http://udb.gov.pk/result.php?search=%D8%AB%D9%82%D8%A7%D9%81%D8%AA

۴۔محمد بن مکرم بن منظور،لسان العرب الجلالتاسح(بیروت: دار صادر،۲۰۰۹ء)، ص ۱۹۔

۵۔سبط حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: ذکی سنز پرنٹرز،۲۰۰۷ء)، ص ۱۹۔

۶۔ جمیل جالبی،پاکستانی کلچر (کراچی: مشتاق بک ڈپو،۱۹۶۴ء)، ص ۴۸ تا ۵۰۔

۷۔سید عبداللہ،کلچر کا مسئلہ (لاہور: عملی پرنٹنگ پریس،۱۹۷۷ء)، ص ۲۱۔

۸۔فیض احمد فیض،پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش (لاہور: فیروز سنز،۱۹۸۸ء)، ص ۲۰۔۲۵۔

۹۔وزیر آغا،کلچر کے خدوخال (لاہور: علی پرنٹرز،۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۵۔

۱۰۔سبط حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی: ذکی سنز پرنٹرز،۲۰۰۷ء)، ص ۱۸۔

۱۱۔روبینہ سلطان،تین نئے ناول نگار (لاہور: دستاویز مطبوعات،۲۰۱۲ء)، ص ۱۰۴۔

۱۲۔غفور احمد،نئی صدی ،نئے ناول(لاہور: کتاب سرائے،۲۰۱۴ء)، ص ۲۷۴۔۲۷۵۔

۱۳۔حسن منظر،دھنی بخش کے بیٹے (کراچی: شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۸ء)، ص ۳۵۔

۱۴۔ایضاً، ص ۳۲۵۔

۱۵۔انور سدید،ڈاکٹر حسن منظر۔۔۔اردو کا انوکھا افسانہ نگار، مشمولہ ہفت روزہ ندائے ملت،لاہور، جلد ۴۰، شمارہ ۴۶، ۱۳/۱۴ نومبر،۲۰۰۸۔

۱۶۔حسن منظر، العاصفہ(کراچی: شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۶ء)، ص ۸۔

۱۷۔ایضاً، ص ۱۲۸۔

۱۸۔ممتاز احمد خان،اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار (لاہور: فکشن ہاؤس پبلشرز،۲۰۱۲ء)، ص ۵۴۔

۱۹۔ حسن منظر،العاصفہ،۱۱۹۔۱۲۰۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۲۱۔ ایضاً، ص۹۹۔۱۰۰۔

۲۲۔ حسن منظر،انسان، اے انسان(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۱۳۸۔۱۳۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص۲۵۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص۴۴۶۔

۲۵۔ حسن منظر، حبس(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۱۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص۹۔

۲۸۔ حسن منظر،دو مختصر ناول(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۱۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۱۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۱۶۔

۳۱۔ ایضاً، ص۸۶۔

۳۲۔ ایضاً، ص۳۷۔

۳۳۔ حسن منظر،دھنی بخش کے بیٹے(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۸ء)، ص۳۴۱۔۳۴۲

۳۴۔ ایضاً، ص۳۴۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۳۶۸۔

۳۶۔ ایضاً، ص۳۹۵۔

۳۷۔ حسن منظر،دو مختصر ناول(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۸۱۔۸۲۔

۳۸۔ حسن منظر،دھنی بخش کے بیٹے(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۸ء)، ص۳۱۰۔۳۱۲۔

۳۹۔ حسن منظر،انسان، اے انسان(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۱۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص۳۱۔

۴۱۔۔ حسن منظر، حبس(کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص۲۲۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۳۔

باب چہارم:

حسن منظر کے ناولوں میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کا مطالعہ

چوتھا باب:

حسن منظر کے ناولوں میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کا مطالعہ

ترک سکونت کے تناظر میں حسن منظر کے ناول ایک اہم حوالہ ہیں۔ منصف اپنے ناولوں میں تارکین وطن کے مسائل کو کہیں تو سلسلے وار طریقے سے بیان کرتے ہیں اور کہیں یہی مسائل ان کے ناولوں کے کرداروں میں ماضی کی کرب ناک یادوں کی صورت میں نمایاں ہوتے دکھائے دیتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں تارکین وطن کی ان مجبوریوں، کشمکش اور تذبذب کا تذکرہ کرتے ہیں جو تارکین وطن کے یہاں معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی مسائل کو جنم دیتیں ہیں۔ وہیں یہ مسائل تارکین وطن میں کئی نفسیاتی امراض کا بھی سبب بن جاتے ہیں۔

حسن منظر کے ناولوں میں جو ترک سکونت دکھائی دیتی ہے۔ وہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کی ترک سکونت سے بہت مختلف ہے۔ حسن منظر کے ناولوں میں تارکین وطن کے یہاں ترک سکونت کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ان لوگوں کے ہیں جو اپنے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کا شکار ہوتے ہیں۔ معاشرے میں موجود سرمایہ دار طبقہ جب مزدوروں کا استحصال کرتا ہے اور انھیں ان کی محنت کے مطابق اجرت نہیں دیتا ہے تو یہ طبقہ دل برداشتہ ہو کر اپنے ملک سے فرار حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جاگیردارانہ سماج کے ظلم اور بے انصافی سے تنگ آکر لوگ اپنی ہی زمینوں کو چھوڑنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں موجود سماجی، سیاسی اور معاشی عدم استحکام ہی لوگوں میں ترک سکونت اختیار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ یوں بہتر زندگی اور بہتر روزگار کی تلاش کے لیے لوگ ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے دیگر ممالک کا رخ کر جاتے ہیں۔

تارکین وطن جب معاشی آسودگی اور بہتر زندگی کے لیے دیگر ممالک کا رخ کرتے ہیں تو انہیں کئی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ تارکین وطن کا دیار غیر میں رہنا، طرز بود و باش، احساس تنہائی، تہذیبی و ثقافتی چپقلش، جنسی بے راہ روی، نسلی تعصب، جنسی و ذہنی انتشار اور اپنے مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کا خطرات وہاں انہیں دیگر سماجی مسائل سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ مسائل ہیں جو تارکین وطن کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

حسن منظر چونکہ پیشے کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر ہیں۔ اور اسی پیشے سے وابستگی انہیں دیگر ممالک میں سکونت اختیار کرواتی رہی ہے۔ بیرون ممالک مقیم رہتے ہوئے حسن منظر نے سعودی عرب، امریکہ، یورپ اور دیگر ممالک میں وہاں بسنے والے تارکین وطن کے مسائل کو نہ صرف دیکھا اور سمجھا ہے، بلکہ انہی مسائل کو بالواسطہ اور بلاواسطہ اپنی کہانیوں کا حصہ بھی بنایا ہے۔ ترک وطن کرنے والے تارکین وطن کی بیرون ممالک زندگی، تہذیبی و ثقافتی شکست وریخت کا سامنا، مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کا خطرہ، اپنی نسل نو میں روایات و اقدار کے حوالے سے شکست وریخت اور جنسی بے راہ روی ان تمام واقعات کو حسن منظر نے پوری جزئیات کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کرتے دکھائی ہے۔

جنسی بے راہ روی کے مسائل:

جنسی بے راہ روی کے مسائل کے حوالے سے حسن منظر کا ناول دھنی بخش کے بیٹے اہم ناول ہے۔ حسن منظر نے اس ناول میں تارکین وطن کے مسائل کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ناول میں منصف مغربی ممالک میں جنسی بے راہ روی کے واقعات کو جزئیات نگاری کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ قاری کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ناول سے اقتباس

> تمہارا خوف یہ ہے کہ تین سال کی عمر میں ہمارا بچہ لڑکی اور لڑکے کی تمیز کرنے لگے گا اور آٹھ سال کی عمر میں اپنے کلاس میں کسی لڑکی کے ہونٹوں پر پیار کرتا ہوا دیکھا جائے گا۔ تم اور میں سکول بلائے جائیں گے اور وہاں ٹیچر سے یہ سننا پڑے گا کہ ماں باپ کے درمیان ایسے کھیل ہوتے ہیں جو بچوں کے سامنے نہیں کھیلے جانے چاہئیں اور ہم سر جھکائے وہاں سے چلے آئیں گے [1]

ناول کی کہانی دراصل امریکہ جیسے آزاد معاشرے میں رہنے والے تارکین وطن کی زندگیوں کے شب و روز کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار احمد بخش ہے۔ جو پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام سے تنگ آ کر بیرون ملک ترک سکونت اختیار کرتا ہے۔ ناول میں احمد بخش کا کردار ماضی اور حال کی کشمکش میں گم دکھائی دیتا ہے۔ وہ امریکہ اور پاکستان کی زندگی کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اور اس پر اپنے رائے کا اظہار بھی کرتا ہے۔

ناول میں احمد بخش امریکہ جیسے جدید دور میں رہتے ہوئے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں سے ہمکنار ہے۔ وہ ذہنی کرب اور اذیت میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں احمد بخش کی ذہنی اذیت کا سبب وہ مسائل دکھائے گئے ہیں۔

جو اسے بیرون ملک میں در پیش رہے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ جنسی بے راہ روی کا بھی ہے۔ ناول میں احمد بخش جب امریکہ جیسے آزاد خیال ملک میں سکونت اختیار کرتا ہے تو وہاں اسے جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ جنسی استحصال کے واقعے کا ذکر احمد بخش اولا سے یوں کرتا ہے۔

> جب میں نے یہاں نیا نیا پڑھانا شروع کیا تھا، تم بعد میں آئی تھیں (اولا نے کہا، دو ہفتے بعد) ایک دن کلاس کے خاتمے پر جب میں اپنے کمرے میں جا رہا تھا میرے پیچھے سے ایک لڑکی آئی۔ اور جیسے ہی دروازہ کھلا، وہ مجھے پیچھے سے دھکا دیتی ہوئی میز تک لے گئی یہاں تک کہ میں اس پر بیٹھ گیا اور سہا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔اس نے میرے جسم پر حملہ کر دیا۔۔۔۔۔اس واقعے کا ذکر آج سے پہلے میں نے کسی سے نہیں کیا۔۔۔ مرد کے ایسے تجربے rape(زبردستی کا جنسی فعل) بھی نہیں گنے جاتے ہیں۔[۲]

ناول میں احمد بخش بیرون ملک میں اپنے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کی وجہ سے خوفزدہ دکھائی دیتا ہے۔ مغربی ممالک میں جنسی بے راہ روی کے باعث احمد بخش کشمکش کا شکار ہے۔ بیرون ملک میں جنسی بے راہ روی عام ہے۔ وہاں خونی رشتوں میں بھی اعتبار نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں لادینیت کے تصور ہی نے جنس پرستی کو عام کر رکھا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں جنسی بے راہ روی حیوانیت کے درجے تک پہنچ چکی ہے۔ مغربی ممالک میں آئے دن بڑھتے جنسی تشدد کے واقعات ہی بچوں اور بڑوں میں ذہنی و نفسیاتی دباؤ کا سبب بنتے جا رہے ہیں۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے میں جنسی بے راہ روی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نوجوان نسل کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو حسن منظر کرداروں کی گفتگو کے ذریعے سے یوں بیان کرتے ہیں۔

> اخبار میں ایک لڑکے کا واقعہ اس نے پڑھا جو باپ کی بندوق لے کر ایک دن اپنے سکول پہنچا اور اپنی کلاس کے بے خبر بچوں کو اس نے نشانہ بنا ڈالا۔۔۔ آگے چل کر سارا واقعہ اس طرح چھپا کہ لڑکے نے سابقہ ماں باپ کی گفتگو ایک رات سنی تھی جب ماں بیٹے سے ملنے آئی تھی اور اسے شوہر نے رات کو رک جانے کے لیے کہا۔۔۔۔ دفعتاً باپ کی آواز آئی، مجھے نہیں معلوم مارک کس کا لڑکا ہے۔ تمھاری جنسی فیاضی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ پھر ماں کی آواز آئی، ہا! میری جنسی فیاضی!؟ اور تمھاری کیا ہوتی ہے؟ جنسی خیرات؟۔۔۔ مارک رات بھر جاگا اور دونوں کو باپ کی گن سے شوٹ کرنا چاہتا تھا۔۔۔ مارک اسکول کے بچوں کو ان کے ماں باپ سے بچانا چاہتا تھا۔[۳]

ناول دھنی بخش کے بیٹے میں منصف نے تارکین وطن میں جنسی بے راہ روی کے مسائل کو بھی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مغربی ممالک میں جنسی بے راہ روی نے احمد بخش اور اولا کے کردار کو ذہنی طور پر پریشان کر رکھا ہے۔ بیرون ملک میں جنسی آزادی کے حالات و واقعات نے تارکین وطن کو داخلی طور پر انتشار کا شکار کیا ہے۔ ناول میں موجود اولا اور احمد بخش کے کرداروں میں مغربی ممالک میں بڑھتی جنسی بے راہ روی کے باعث ذہنی جنگ چلتی رہتی ہے۔ جس کا ذکر اولا ناول میں یوں کرتی دکھائی دیتی ہے۔

> احمد بخش ایک خلش میں گرفتار نظر آتا تھا۔ اس کے دماغ میں جو جنگ جاری تھی اس سے وہ واقف تھی۔ اگر وہ چاہتا تھا کہ ہومر اور سیلی بڑے ہو کر ویسے نہ نکلیں جیسے ایک صدی سے امریکی بچے ہوتے آئے تھے تو یہ کیا تھا؟۔۔۔ وہ خود کو غیر ملکی سمجھتا تھا اور چاہتا تھا اس کے بچے بھی عمر بھر یہاں غیر ملکی بن کر رہیں۔۔۔ بارہا اس نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ امریکا کے سفید اور سیاہ بچے تیرہ، چودہ سال کی عمر میں ڈیٹنگ شروع کر دیتے ہیں۔ لڑکیاں جا کر اپنے رحم کو بار بار صرف کرا آتی ہیں۔ لڑکے سامان ہلاکت بہ آسانی حاصل کر لیتے ہیں اور جہاں جائیں انھیں ساتھ رکھتے ہیں۔ کبھی اولا ذہن میں احمد بخش کی زندگی اور فکر کی فلم الٹی چلا کر دیکھتی تھی کبھی شروع سے۔[۲]

العاصفہ میں منصف نے معاشرے میں موجود جنسی بے راہ روی کو عرب ممالک میں مقیم تارکین وطن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ عرب ممالک میں غیر ملکی لوگوں کا قیام، اعلیٰ افسران کے لئے قانون کے دوہرے معیار اور نچلے طبقے کے لوگ یہ تینوں عناصر ناول میں جنسی بے راہ روی کے رجحان کا باعث بنتے ہیں۔ ناول میں انہی کرداروں کے گرد گھومتے واقعات کے ذریعے سے منصف معاشرے میں جنسی بے راہ روی اور افراتفری کا بیان کرتے ہیں کہ کس طرح یہ انسان کی ذہنی و جسمانی شکست و ریخت کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ ناول العاصفہ کے بارے میں مسکین احمد منصور لکھتے ہیں کہ:

> العاصفہ حسن منظر کا جدید اور غیر معمولی ناول ہے جس میں نہ صرف ان تمام اجزائے ترکیبی کو خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس ناول میں سوچنے سمجھنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے۔۔۔۔۔ یہ ناول بنتے بگڑتے اور تبدیل ہوتے ہوئے انسانی رشتوں کی کہانی ہے۔ رشتے جن کی انسانی ضروریات اور حالات کی مجبوریاں شکلیں بدل دیتی ہیں۔ لیکن یہ ایسے رشتوں کی داستان بھی ہے۔ جو ایک بار قائم ہو جائیں تو زندگی بھر بلکہ موت کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتے ہیں۔ وقت کی نہ اٹھنے والی تہیں انھیں دھندلا ضرور کر دیتی ہیں لیکن ختم نہیں کر سکتیں۔

العاصفہ انہی رشتوں کی کہانی ہے۔ جو زندگی کو مفہوم بخشتے ہیں۔ اور جن کے بغیر ایک ناقابل برداشت دنیا کا تصور مشکل ہے۔[۵]

العاصفہ کی کہانی ایک ایسے نچلے طبقے کے کردار زید کے گرد گھومتی ہے جو اپنے گھریلو حالات، ملک کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی نظام سے دلبرداشتہ ہے۔ناول میں منصف نے ایک ایسے پس ماندہ عرب معاشرے کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ جن کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی واضح مقصد ہی موجود نہیں ہے۔ایسے معاشرے میں رہنے والے لوگ اپنی سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں کھو چکے ہیں۔ان عرب ممالک کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد شادیاں اور بچے پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ناول میں زید کا کردار اپنے دوست محمد فاعور کی زندگی کے بارے میں بتاتے ہوئے عرب معاشرت کی عکاسی یوں کرتا ہے۔

> محمد سے بات کر کے مجھ پر عجیب طرح کی جھونجھل سوار ہو جاتی تھی کیوں کہ وہ بغیر شرمائے بلا جھجکے اپنا جنسی نظریہ بیان کیا کرتا تھا۔۔۔لڑکی بدویہ ہو یا حضریہ، اپنے ملک کی ہو یا باہر کی، بس ملنی چاہیے اور اگر مل جائے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی اصل کیا تھی' کبھی وہ کہتا تھا، مجھے مصر پسند ہے، اطالیہ پسند ہے، المانیہ پسند ہے، لیکن ہر ملک میں ہمیشہ تو نہیں رہا جا سکتا ہے، البتہ اس ملک کو اپنے گھر لایا جا سکتا ہے۔۔۔مطلب سمجھے؟ پھر وہ بے تکی ہنسی ہنستا تھا۔۔۔۔ ہر بوالہوس کی طرح وہ سوچنے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور پورے وثوق سے بے معنی باتیں کر سکتا تھا۔[۶]

ناول میں موجود زید عرب لوگوں کی طرز زندگی اور طرز بود و باش کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار دکھائی دیتا ہے۔زید نے جس معاشرے میں جنم لیا ہے وہ قدروں کی ٹوٹ پھوٹ اور اخلاقی زوال کا شکار ہیں۔جہاں ہر کردار دوہرے طریقے اپناتے ہوئے اپنے معاشرے اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کو مزید پستی اور گراوٹ کی طرف دھکیل رہا ہے۔

العاصفہ میں زید ایک ایسے معاشرے کا متلاشی ہے جو اسے ذہنی اور معاشی آسودگی فراہم کر سکے لیکن جس ماحول میں یہ کردار وقوع پذیر ہے وہ اس کی شخصیت کو منتشر کر دیتا ہے۔آئے دن گھر کے جھگڑوں اور باپ کی گھناؤنی حرکتوں (جوا، شراب نوشی، جھوٹ، دھوکا دھری اور عورتوں کا دلال ہونا) سے گھر کی فضا مکدر ہو چکی ہے ۔یوں اپنی گھریلو زندگی اور سماج کے ماحول سے زید دلبرداشتہ ہو کر ج آئل کمپنی میں سکونت اختیار کر لیتا ہے۔

آئل کمپنیوں پر غیر ملکی تارکین وطن کی اجارہ داری ہے۔ ناول کی کہانی کا تانا بانا منصف نے اُن غیر ملکی تارکین وطن کے گرد بنا ہے جو عرب ممالک کے وسائل پر آہستہ آہستہ قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ عرب ممالک کے

زیادہ تر شعبوں پر انہی غیر ملکی تارکین وطن کی حکمرانی ہے اور وہ ہر جائز وناجائز طریقے سے عرب ممالک کے وسائل کا فائدہ اٹھارہے ہیں۔ عرب ممالک کے اعلیٰ افسران تک میں ہمت نہیں ہے کہ وہ ان غیر ملکی تارکین وطن کے خلاف کاروائیاں کر سکیں۔ناول میں موجود زید اپنے ملک پر غیر ملکی تارکین وطن کی اجارہ داری کو ہی عرب ممالک میں جنسی بے راہ روی کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔اور اس بے راہ روی ذکر وہ یوں کرتا ہے۔

> میں اس بندر گاہ کو اپنی حفاظت کے لیے 'ک' کہتا ہوں۔وہاں ایک کانے شیخ کی حکومت ہے اور کھلے عام شراب بیچنے اور پینے پر پابندی ہے، لیکن اس بندر گاہ میں حکم انگریزوں کا چلتا ہے اس لیے افسروں کو پینے کے لیے ہفتہ وار کوتا(quota)ملتا ہے اور چھپ کر پینا جائز سمجھا جاتا ہے ۔۔۔ک میں انگریز افسر اپنا فالتو کوتا اور شراب کے منکر (teetotaler's)پورے کا پورا عربوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔اس طرح لوگ پیتے بھی ہیں اور ملک کی پارسائی کا بھرم بھی قائم رہتا ہے۔[۷]

زید اپنے عرب ملک میں جن برائیوں اور عمل کو برا سمجھتا ہے۔ بالآخر خود بھی انہی کاموں میں ملوث ہو جاتا ہے۔وہ غیر ملکی تارکین وطن کے لیے لڑکیاں فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی مہیا کرنے کا کام کرتا ہے ۔غیر ملکی امریکی افسران کو خوش کرنے کے لیے کیے جانے والے غلط کام ہی اس کی زندگی میں بے چینی اور اضطرب کو ظاہر کرتے ہیں۔ناول میں زید اپنے انہی کاموں کی وجہ سے داخلی ٹوٹ پھوٹ کا شکار دکھائی دیتا ہے۔اپنے ملک میں جنسی بے راہ روی اور مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کی وجہ زید غیر ملکی تارکین وطن کو ٹھہراتا ہے۔غیر ملکی امریکی افسران کو لڑکیاں اسمگل کرنے کے ایک واقعے کا ذکر زید یوں بیان کرتا ہے۔

> جون ابداتک اور اس کی سرخ چہرے والی لڑکی کے ساتھ ایک دن کا نصف حصہ میں نے بھی گزارا تھا۔جون برابر پیتا رہا تھا اور لڑکی اس کے گلاس کو رد کرتی رہی تھی۔گلاس ہی نہیں اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں کو بھی۔۔۔۔۔وہ جون کو دھکا دے کر کنارے کے اتھلے پانی میں کود ی اور اس ادھورے کپڑے میں جس نے اس کے سینے کو بمشکل اور نیچے کے حصے کو کسی حد تک چھپا رکھا تھا جا کر کھلی چھت کی کار میں بیٹھ گئی۔۔۔۔میں کار وہیں چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح اپنے فلیٹ پہنچا اور دن بھر سوچتا رہا آخر میری زندگی کس کام کی ہے۔[۸]

ترک سکونت کے وقت تارکین وطن کرب اور تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں۔ساری عمر وہ نارمل زندگی کی طرف واپس نہیں آسکتے ہیں۔ناول بیر شیبا کی لڑکی کا نسوانی کردار جو یہودی النسل سے تعلق رکھتا ہے

۔۱۹۳۹ء میں نازی حکومت کی ستم ظریفی کی وجہ سے ایک کرسچین فیملی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ناول میں ربیکا کے کردار کی صورت میں کی جانے والی ترک سکونت تارکین وطن میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کو اجاگر کرتی ہے ۔مہرونہ لغاری اس ناول کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> حسن منظر نے ناول میں کہانی کی بنیاد ایک ایسے واقعہ پر رکھی ہے جس کے بارے میں یہودیوں میں تعصب پایا جاتا ہے اور جسے پوری دنیا ہولوکاسٹ کے نام سے پہچانتی ہے۔یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں جرمن فوج نے دنیا بھر سے یہودیوں کو چن چن کر مارا ۔۔۔۔۔۔ان پر جو بیتی، وہ دکھ کی اور اذیت کی ایک بہت بڑا میراث اپنے پیچھے والوں کے لیے چھوڑ گئے۔اب حسن منظر نے درد کی یہ بہت بڑی دولت اپنے مرکزی کردار کی جھولی میں ڈال دی۔اس درد نے ربیکا کی زندگی کو پیچیدہ کر دیا۔[۹]

جنسی بے راہ روی کی صورتحال کا سامنا ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ربیکا کا کردار پیشے کے اعتبار سے ایک نرس کا دکھایا گیا ہے۔نرس ہونے کی وجہ سے ربیکا دیگر ممالک کا رخ کرتی ہے تو اسے جنسی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ایک انجان ملک میں تنہا زندگی بسر کرتے دیکھ کر ڈاکٹر بھورے، ڈاکٹر ہینز اور ڈاکٹر نورمن اسے جنسی تسکین کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا اپنے جنسی طور پر ہراساں کئے جانے والے واقعات کا ذکر اس طرح کرتی ہے۔

> ایک لڑکی جو لڑکی نہیں رہی ہے، عورت ہے اس کی سوسائٹی میں زندہ رہنے کے خطرے، خاص طور سے اگر وہ آوٹ ڈور کام کرتی ہے۔۔۔ایک عورت جس کی پشتی بان کوئی مرد نہیں ہے اور وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی ہے ہر ملنے والا اس پر حرص کی نگاہیں رکھتا ہے۔۔ہر مرد بھی جس کی بیوی اس سے عمر میں بڑی ہو یا بڑی لگنے لگی ہو اور جس کے مینسیزmenses کے ختم ہو جانے کا زمانہ آگیا ہو اور وہ خود ابھی بوڑھا نہ ہوا ہو، ہر عورت اور لڑکی سے اپنا شکار کرانے کو تیار رہتا ہے، یا اسے لگتا ہے ہر جوان عورت یا لڑکی اس پاکیزگی کو شکست دینے پر تلی ہوئی ہے۔[۱۰]

حسن منظر کے ناول انسان! اے انسان کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمن بھی اخلاقی تفاوت کے مسائل سے دوچار ہے۔ناول میں موجود تلمیذ الرحمن کا کردار شروع سے ہی گناہ اور گندگی میں کھڑا نظر آتا ہے۔ناول کے آغاز ہی میں مخالف جنس تلمیذ الرحمن کے ساتھ چھپ کر نازیبا حرکات کرتی ہے۔پھر تلمیذ الرحمن اس عمل کو دوبارہ دوہرانے کے لیے کسی اور لڑکی کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لڑکی تلمیذ الرحمن کی شکایت

اس کے والد سے کرتی ہے۔ یہ جنسی فعل تلمیذ الرحمن کی سائیکی کو سخت مجروح کرتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ گناہ چھپ کر کئے جانے والا عمل ہے۔ اور جو گناہ منظر عام پر نہ آسکے، صرف وہ ہی قابل معافی ہے۔

اس جرم کی پاداش میں تلمیذ الرحمن کے والد اس کی اصلاح کرنے کے بجائے اسے نینی پور سے راجدھانی بڑی آپا کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ جہاں تلمیذ الرحمن کی نینی پور سے راجدھانی کی جانے والی ترک سکونت اس کے کردار میں مزید جنسی افراتفری اور بے راہ روی کا جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ "پہلے کوٹھے پر تلمیذ ایمن کے ساتھ گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں اسے وہاں کی بس چند باتیں یاد رہ گئی تھیں۔ وہاں جا کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی کسی نے آہستہ سے بجائی۔[11]

اپنے گھر، ماں باپ سے دوری ہی تلمیذ الرحمن کو جنسی بے راہ روی کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو بے معنویت جانتے ہوئے جوئے سے شراب اور شراب سے طوائفوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ناول میں تلمیذ الرحمن کی زندگی کی تلخیوں اور محرومیاں ہی اسے جنسی بے راہ روی کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ ناول میں موجود تلمیذ کا کردار ایک بار پھر سے ترک سکونت کے تجربے سے گزر کر فلم کیپٹل سٹی کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

فلم کیپٹل سٹی میں آجانے اور اپنی زندگی کی بقا کے لئے تلمیذ کو تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ وہ اپنے دوست ایمن کی مدد سے فلم انڈسٹری میں چھوٹے موٹے کام کرنے لگتا ہے۔ یہاں تلمیذ الرحمن کا کردار جب دل آرا، فتی، رشو، اور کلو جیسے نچلے طبقے کے کرداروں سے ملتا ہے تو مزید اخلاقی پستی اور جنسی بے راہ روی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے تمام شب و روز جوئے، شراب اور شباب کے کوٹھوں پر بسر ہوتے ہیں۔

انسان، اے انسان میں الرحمن اپنی زندگی سے مایوس دکھائی دیتا ہے۔ اور جب یہ کردار اپنی زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اپنے کئے ہوئے گناہ احساس ندامت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ ذہنی کشمکش اور احساس گناہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اپنی ایسی تلخ اور محرومیوں سے بھری زندگی کا ذمہ دار وہ نینی پور سے راجدھانی پھر جنسی بے راہ روی اور جوئے کو ٹھہراتے ہوئے اپنی ذہنی کیفیات کا ذکر یوں کرتا ہے۔

> اس خرابی کا ذمے دار جوا تھا۔ نہ وہ پیسے جیب میں ہوتے نہ تنگ گلی جاتا، نہ بھاڑ کے بھنے چنے کھاتا، اور ان کے بغیر بھوک سے لڑا کرتا۔۔۔۔ اس وقت ندامت اور گناہ کا احساس اگر پچھلی دفعہ کے بعد ذہن میں کچھ بھی بچ رہا ہو اور پیسے جیب میں ہوں اس خرابی کی قوت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے

تھے۔ کوٹھے اپنی طرف بلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔۔۔۔ جوئے سے توبہ اور توبہ ٹوٹنے سے پہلے جو کش مکش پیدا ہوتی تھی اور بعد میں دل اور دماغ کو جلا دینے والی ندامت۔۔۔[۱۲]

اسی ناول میں حسن منظر نے برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے واقعات اور تقسیم ہند کے دوران کی جانے والی ترک سکونت کو بھی بیان کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمن بھی فسادات کا شکار ہوتا ہے۔اور نئے ملک پاکستان آجاتا ہے۔وہ ترک سکونت کے تمام تکلیف دہ حالات وواقعات کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔بلکہ ان حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔وہ پاکستان کی جانے والی ترک سکونت کے تجربے کا ذکر کچھ اس طرح کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ہر کمرے میں کئی خاندان رہ رہے تھے۔ فرنیچر صرف مینجر کے دفتر میں تھا۔باقی کو اس کی کیا ضرورت تھی۔لوگ آتے تھے، بیوی بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر رشتے داروں کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔۔۔۔۔رات کو کسی ایک بستر پر دو چار مسافر اس طرح جمع ہو جاتے جیسے میٹنگ ہے ۔اور اس میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے۔ ملک قائم رہے گا اس کا سب کو یقین تھا۔خود ان کا آنے والے دنوں میں کیا بنے گا۔دل کے اس نازک تار کو چھیڑتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔ جسے وہ چھوڑ آئے تھے اب وہ وہاں نہیں رہا ہے، لوٹ کر کہاں جائیں گے ؟۔۔۔۔۔ تلمیذ کے ذہن میں یہ سب سین اس طرح باقی رہے جس طرح ڈوکیومینٹری فلموں کے کراؤڈ سین ہوتے تھے۔[۱۳]

ناول میں منصف نے صرف ترک سکونت کے کرب ناک واقعات کو ہی بیان نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ایک ایسے ملک کا نقشہ کھینچا ہے جہاں ترک سکونت کے تجربے سے گزر کر آنے والے تارکین وطن کو سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔پاکستان کے مختلف شعبوں میں ایسے لوگ مقرر ہوئے جنھوں نے پاکستان میں کرپشن، لوٹ مار، جنسی استحصال اور جرائم کو فروغ دیا۔

مصنف نے ناول انسان! اے انسان میں ایسے کردار بھی تخلیق کیے جنھوں نے پاکستان کو سماجی سطح پر نقصان پہنچایا۔ ان کرداروں میں غیور کا کردار ایک جرنلسٹ کا دکھایا گیا ہے۔ یہ کردار صحافت کے پیشے کو اپناتے ہوئے لوگوں کو بلیک میل کرتا ہے۔ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت کمانا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔اسی طرح وکیل مرتضی قریشی کا کردار بھی شراب وشباب کا رسیا ہے۔شان الہی کا کردار ایک کلرک کا کردار دکھایا گیا ہے جو محکمہ

فیڈریشن میں گڑبڑ کرتا رہتا ہے۔ یہ تمام کردار پاکستان میں کرپشن، دھوکا دہی اور لوٹ مار کے ذریعے سے ملک کی فضا خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

اسی طرح حسن منظر کے ناول حبس کے کردار بھی اخلاقی تفاوت کے مسائل کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کی بنیاد منصف نے اسرائیل اور فلسطین کے تنازعے پر رکھی ہے۔ یہ ناول فلسطین پر مغربی استعماریت کے اتحادی فوجیوں کی یلغار اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت کے پس منظر اور پیش منظر کو بیان کرتا ہے۔ جہاں فلسطینیوں پر روا رکھے جانے والے سلوک اور ظلم و ستم پر مسلمان اقوام اور عرب ممالک خاموش تماشائی بنے نظر آتے ہیں۔

حسن منظر کے اس ناول کا معروف کردار ایرک شیر ون ہے۔ منصف نے ناول کا آغاز ہی ایرک کے مختصر تعارف سے کیا ہے۔ جو ملک اسرائیل کا گیارہویں وزیر اعظم دکھایا گیا ہے۔ یہ کردار فالج کے حملے کی وجہ سے ہسپتال جاتا ہے، جہاں وہ جسمانی طور پر غیر متحرک حالت کے سبب داخل کر لیا جاتا ہے۔ ہسپتال کے ایک کمرے میں گہری نیند میں ہونے کے باوجود ایرک کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور دنیا کو دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ ایرک کا کردار ہسپتال کے ایک کمرے میں اپنی فیملی کی ٹیڑھی لگی تصاویر، اپنی صحت، اپنی زندگی کے حالات و واقعات، خیالات اور ڈاکٹر کے اسٹاف کو نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ ان کی گفتگو اور احساسات پر غور کرتا رہتا ہے۔

ناول میں منصف نے اس کردار کی زبانی سے فلسطینیوں سے روا رکھے جانے والے مظالم کی دردناک کہانی بیان کروائی ہے۔ ناول میں ایرک کا کردار یہودی النسل دکھایا گیا ہے، جو اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہو کر پوگروم اور ہولوکاسٹ کے اذیت ناک واقعات کو قاری کے سامنے بیان کرتا ہے۔ جب روس، اسپین، فرانس، پرتگال اور دیگر ممالک نے یہودیوں کا بڑی بے دردی سے قتل عام کیا۔ اور جو یہودی جرمنی نازی حکومت کے ہاتھوں بچ گئے وہ اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ زیادہ تر یہودیوں نے فلسطین کی سرزمین میں پناہ لی۔ جہاں فلسطینیوں نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حسن منظر یہودیوں کی فلسطین آمد کے بارے میں لکھتے ہیں

> یورپ میں بسے ہوئے یہودیوں نے خود کو ان ممالک میں ہمیشہ غیر محفوظ پایا۔ انتہائی مغرب سے لے کر انتہائی شرق تک ہر ملک نے انہیں سوسائٹی کا ایک گرا ہوا طبقہ سمجھا۔۔۔۔۔ ان کا قتل عام ان ملکوں کی تاریخ کا حصہ بنا۔ بعض ملکوں میں ان کے داخلے پر پابندی بھی عائد کی گئی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ اور اکثر ملکوں سے انہیں جانیں گنوا کر لٹ لٹا کر بھاگنا پڑا۔۔۔۔صلاح الدین نے انہیں فلسطین میں آ بسنے کی دعوت دی۔ بغیر کسی قسم کی پہلے سے طے کی ہوئی شرائط اور پابندیوں کے۔[۱۴]

مغربی استعماریت کا یہودیوں سے کیا جانے والا سلوک، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت، خواتین کی عصمت دری اور ہوس پرستی کے تکلیف دہ واقعات ہی نے یہودیوں میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کو اجاگر کیا۔ پھر یہودیوں نے بھی فلسطینیوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جن سے گزر کر وہ فلسطین آباد ہوئے۔ یوں فلسطینی اپنے ہی ملک میں رہتے ہوئے اخلاقی تفاوت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ کیجیے

اس وقت ایرک تم سائیکو اینالسس کے کاؤچ پر لیٹے ہو لیکن اینالسٹ تمہارا آدمی سگمیڈ فرونڈ نہیں ہے، میں ہوں۔ تمہارے دماغ کا وہ حصہ جو تمہارے جلا کر بھسم cremate کیے جانے یا قبر میں مٹی بن جانے کے بعد بھی زندہ رہے گا، اسے تسلیم کرو کہ تم میں آج بھی یہ قوت نہیں ہے کہ اپنے سابقہ ظلم کرنے والوں سے اپنا بدلہ لے سکو۔ تم نے اپنے اگریشن جارحیت کے اخراج کے لیے انہیں چنا ہے جن کے پاس نہ اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار ہیں نہ دوسرے ملکوں سے کمک مل رہی ہے۔[۱۵]

یہ یہودی بجائے فلسطین کے احسان مند ہونے کہ انھوں نے انہیں اپنی سرزمین میں رہنے کی جگہ دی ہے۔ اس کے برعکس ایک یہودی مفکر ہرزل نے اس نظریے کی بنیاد ڈالی کہ سرزمین فلسطین مذہبی نقطہ نظر سے یہودیوں کے لیے اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سرزمین پر ہمارے انبیاء کرام (حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء) نازل ہوئے تھے۔ اس طرح یہاں فلسطین نام کا کوئی ملک اور قوم کبھی بھی وجود میں نہیں آئی۔ یہ صرف اور صرف یہودیوں کی آبائی سرزمین ہے۔ اور انہیں ہی یہاں رہنے کا حق حاصل ہے۔ تھیوڈور ہرزل کے اس نظریے کو یہودیوں نے بنیاد بناتے ہوئے فلسطینیوں کو ان کی ہی سرزمین سے بے گھر کرنا شروع کیا۔ ناول ایرک کا کردار اس نظریے کی حمایت یوں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

میں اپنی ابتداء کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس ملک کی ابتداء سے پہلے ہوئی تھی اور یہ کہ اس قریے میں پیدا ہوا تھا جس کی قومیت نہیں تھی۔ ۱۹۴۸ء میں اس ملک کے وجود میں آنے سے پہلے جو جو زمین کے اس قطعے میں پیدا ہوا۔۔۔ موزلیم عرب، کرسچن عرب، جیو عرب سب بے قومیت کے ہیں۔ ہم نہ مانتے یہ یا ان کے باپ دادا اس زمین میں پیدا ہوئے تھے جس کا کچھ اور نام تھا۔ نہ میں بائبل میں شامل ان نقشوں کو قابل اعتنا سمجھتا ہوں۔[۱۶]

ناول میں منصف نے اسرائیل کے فلسطین پر قبضے کے نہایت ہولناک واقعات پیش کئے ہیں۔ جس میں کئی ہزار سے زیادہ فلسطینی مارے جا چکے ہیں۔ اسرائیل یہودی بیت المقدس کی سرزمین کو اپنا مذہبی گہوارہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ فلسطین کی سرزمین کے حصول کے لیے فلسطینیوں سے جھڑپیں کرتے رہتے ہیں۔ فلسطین کی فضا میں بمباری کی جاتی ہے۔ یہ یہودی اس ملک کے حصول کے لیے اس قدر اخلاقی پستی کا شکار ہو چکے ہیں کہ انسانیت تک کو بھول چکے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار جب فلسطینی لوگوں خصوصاً عورتوں سے روا رکھے جانے والے سلوک کے بارے میں سوچتا ہے تو دہشت میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔

> ایک اور کیسرا ہے جسے میں کنڈکٹ کر رہا تھا۔ فلسطینی لڑکیاں اور جوان عورتیں فوجیوں کے جسموں کے نیچے مچل رہی ہیں اور جو کھڑے سے گر رہی ہیں ان کے ہاتھ پیٹوں پر ہیں جن میں نازائیدہ بچے اپنی نال سے لٹک رہے ہیں۔۔۔۔ایک آواز مجھ سے کہہ رہی ہے ان اعضا میں مردوں کے بیرونی اعضا بھی ہیں اور عورتوں کے سینے بھی۔ جسم سے علیحدہ ہو کر وہ کتنے بھیانک لگتے ہیں: نہ جنس کی علامت نہ جنس کے اعضا۔۔۔۔ ایک سپاہی عورت کے چرے ہوئے پیٹ سے اس کی زمیں پر گری ہوئی بچہ دانی کو بوٹ سے کچل رہا ہے۔۔۔۔ میں کس اذیت سے گزر رہا ہوں۔[۱۷]

ناول حبس میں منصف نے یہودیوں میں موجود نسلی تعصبات کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ یہودی قومیں خود کو دنیا میں موجود دیگر دوسری قوموں سے برتر اور اعلیٰ نسل گردانتے ہیں۔ یہودی قوم میں دو قسم کے متضاد فرقے موجود ہیں۔ ایک فرقہ وہ ہے جو یورپی کلچر کو اپناتے ہوئے خود کو مغربی ممالک میں مکمل طور پر ضم کر چکے ہیں۔ اس فرقے ماننے والے (gentile) غیر یہود کہلاتے ہیں۔ دوسرا فرقہ تھیوڈور ہرزل کے نظریے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ فرقہ خود کو دنیا میں موجود دیگر اقوام سے الگ اور برتر سمجھتے ہوئے الگ تھلگ رہنے کا قائل ہے۔ اور یہ فرقہ ہی یہودیوں میں زیادہ طاقتور اور موثر نظر آتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایرک شیرون اسی فرقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ فلسطین کی سرزمین کو غیر یہودیوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور اس امر کے لیے ایرک اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے۔

> ہم اس مقدس، سوری قابل تعظیم زمین کو غیر یہود سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اگر اس زمین میں جینا ہے تو وہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنی کیمونٹی کو غیروں سے پاک رکھیں۔ جو غیر ہیں انہیں باہر نکال کیا جائے۔ ملی جلی شادیاں نہ ہوں۔ یہاں کوئی ایسا بھی نہ رہ جائے جس کے خون

میں ملاوٹ ہو۔ اگر یہ ایک کمیونٹی رہے گی تو اپنا دفاع کر سکے گی۔ ورنہ ویسی ہی تباہی اس کا مقدر ہو گی جیسی پہلے آ چکی ہے۔[۱۸]

مختصر یہ کہ اس ناول میں منصف نے یہودیوں کی دسیع تاریخ کے منظر نامے کو بھی شامل کیا ہے۔ کہ کس طرح پہلے مغربی استعماریت نے ان یہودیوں کو دربدر بھٹکنے پر مجبور کیا۔ پھر اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے فلسطین کی سرزمین کا ایک حصہ یہودیوں کو تحفے میں دے دیا۔ یہاں یہودیوں کی بستیوں کو آباد کیا۔ پھر اقوام متحدہ نے یکجا ہو کر فلسطین کی تقسیم کی قرارداد منظور کی۔ ناول میں منصف اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی استعماریت یعنی امریکہ، برطانیہ اور روس جیسے ممالک نے ہی یہودیوں کو فلسطین میں لا بسنے کا کام کیا ہے اور اس امر کے پیچھے بھی ان کے اپنے مقاصد کار فرما ہیں۔ ان مغربی طاقتوں نے یکجا ہو کر فلسطین اور یہودیوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا

۔

مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات:

بیرون ممالک میں سیکولرازم اور لبرل ازم کے فروغ کی وجہ سے ہی تارکین وطن اپنی مذہبی عقائد اور روایات و اقدار سے دور ہو جاتے ہیں۔ سیکولرازم چونکہ لادینیت کی بات کرتی ہے تو مغربی ممالک میں رہنے والے تارکین وطن وہاں اپنے مذہب کی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں۔ جائز اور ناجائز کے فرق کو بھلا کر وہ شخصی آزادی کے حامل ہو جاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں لبرل ازم بھی تارکین وطن کے لیے ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ شخصی آزادی نے ہی مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں میں یہ تصور پیش کیا ہے کہ انسان بحیثیت ایک فرد جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس طرح انسان اپنی احساس ذمہ داری سے فرار ہو کر اپنے مذہب اور روایات و اقدار سے بالاتر ہو کر حرام اور حلال کی تمام تفریق کو ختم کر دیتا ہے۔ یوں مغربی ممالک میں لادینیت اور شخصی آزادی نے انسان کو نفس پرستی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ انسان کو کھلی آزادی دے دی گئی ہے کہ وہ نفس پرستی، شراب نوشی، ہم جنس پرستی اور مفاد پرستی کے مطابق جس طرح چاہے اپنی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں لبرل ازم کے تصور ہی نے خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں میں رشتوں کی پہچان ہی ختم ہو گئی ہے۔ مغربی ممالک میں تیزی سے بڑھتے شخصی آزادی اور لادینیت کے رجحان ہی معاشرے میں پراگندگی اور جنسی ہوس کا سبب بن رہے ہیں۔ اور انہی مسائل کی وجہ سے بیرون ملک مقیم تارکین وطن کو اپنے مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خدشات لاحق ہیں۔

حسن منظر نے ناول میں مغربی ممالک کے ایسے زوال آمادہ معاشرے کا نقشہ کھینچا ہے۔ جہاں مذہبی، سماجی و معاشرتی برائیوں نے قبضہ جماڈالا ہے۔ مغربی معاشرے میں موجود سیکولرازم اور لبرل ازم کی وجہ سے لوگ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لادینیت اور بے جا آزادی کے مسائل کی وجہ سے مغربی معاشرے میں موجود تارکین وطن ذہنی و نفسیاتی سطح پر متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

بیرون ملک میں موجود لادینیت اور بے جا آزادی کی وجہ سے ہی احمد بخش یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کے بچے ایک ایسے معاشرے میں پرورش پائیں، جہاں جنسی بے راہ روی عام ہے اور مذہب کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بیرون ملک میں بڑھتے جنسی واقعات اور لادینیت کے فروغ کے مسائل احمد بخش کو کشمکش کا شکار بنا دیتے ہیں۔ مغربی ممالک میں لادینیت اور شخصی آزادی کے واقعات ہی تارکین وطن میں داخلی طور پر ٹوٹ پھوٹ کی وجہ بنتے ہیں۔ یہاں ناول میں احمد بخش کا کردار اپنی نسل نو میں مغربی ممالک کے بڑھتے جنسی اور لادینیت کے واقعات کی وجہ سے کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

> احمد بخش یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہو مر آگے چل کر ہر کام کے کرنے کے لئے گراس(چرس pot)یا کوکین کا سہارا لینے لگے اور سیلی کو بھی جو زندگی کا ساتھی ملے وہ "میری ہوانا"(Marijuana)اور شراب کا گرویدہ ہو۔ اولا کہتی تھی، تم اتنے سال سے یہاں ہو تم کون سا ان چیزوں کا سہارا لیتے ہو؟ احمد بخش کہتا تھا، میں نہیں لیتا ہوں اس لئے کہ میرے لڑکپن اور نوجوانی یہاں بسر نہیں ہوئے تھے [۱۹]

مغربی معاشرے کی آزادی اب ایسی صورتحال اختیار کر چکی ہے کہ وہاں موجود تارکین وطن شکست وریخت کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ حسن منظر نے ناول میں مغربی معاشرے میں پنپنے والی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے مغربی ممالک میں عام ہوتی ہوئی بے راہ روی اور مذہبی عقائد سے دوری کا ذکر کیا ہے کہ مغربی ممالک میں جہاں دیکھو جنس اور جنسی تعلیم کھلے عام دیکھنے کو ملتی ہے۔ لادینیت، شخصی آزادی اور مادیت پرستی مغربی ممالک میں اس قدر سرائیت اختیار کر چکی ہے کہ وہاں موجود لوگ ذہنی پراگندگی اور انتشار میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

ناول کی کہانی میں حسن منظر نے تارکین وطن کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ جو بیرون ملک میں اپنی روایات و اقدار کی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں۔ اور جب یہ تارکین وطن بیرون ملک اپنا تہذیبی تشخص کھوتے ہیں تو کئی نفسیاتی

الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بیرون ملک میں رہنے والے یہی تارکین وطن نہ تو اپنے مذہب اور کلچر کو مکمل طور پر اپنا پاتے ہیں اور نہ ہی بیرون ملک میں خود کو ضم کر سکتے ہیں۔

اسی طرح مذہبی عقائد سے دوری کی صورتحال ناول العاصفہ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ناول کی کہانی کا موضوع منصف نے ایک ایسے زوال آمادہ معاشرے کو بنایا ہے۔ جہاں اعلیٰ افسران سے لے کر نچلے طبقے سے وابستہ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی مذہبی عقائد اور روایات و اقدار کو بھلا کر خیر اور شر کی تفریق کئے بغیر ہر طرح کے راستے اختیار کرتے ہوئے اپنے مقاصد تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حسن منظر نے ناول میں موجود مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے ذریعے معاشرے میں موجود اُن لوگوں کی ذہنی پراگندگی اور انتشار کو بے نقاب کیا ہے۔ جو اپنے ملک و قوم کے لئے مذہبی اور معاشرتی و تہذیبی گرواٹ کا سبب بن رہے ہیں۔

العاصفہ میں حسن منظر کرداروں میں مذہبی عقائد سے دوری کا سبب مادیت پرستی کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کے نزدیک مادیت پرستی ہی انسان کو منفی راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ اس مادیت پرستی کے سبب ہی انسان اپنی اخلاقی و تہذیبی اور مذہبی اقدار کو کھو کر ذہنی پراگندگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ذہنی پراگندگی ہی انسان کو نفسیاتی و جسمانی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔

ناول میں زید کو اپنے معاشرے کی کھوکھلی اور شکستہ اقدار جو اس ورثے میں ملی ہیں۔ اپنی بچپن کی محرومیوں نے جہاں اس کی ذات کو ریزہ ریزہ کر دیا اور غیر ملکی تارکین وطن کی عرب ملک پر اجارہ داری یہ تمام عناصر جب یکجا ہو جاتے ہیں تب معاشرہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ عرب ممالک کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتے ہوئے انھیں اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور عرب ممالک کے حکمرانوں کی دوہری زندگی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عرب ممالک میں قانون کی سزائیں صرف نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے ہیں ۔جب کہ اعلیٰ افسران اور غیر ملکی تارکین وطن کے لئے ہمارے قانون کی سزائیں کوئی معنی نہیں رکھتیں ہیں قانون کے دوہرے معیار ہی عرب ملک میں مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات کا سبب بنتے جا رہے ہیں۔ عرب ملک اور بیرون ملک ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہو کر زندگی گزار سکتے ہیں۔ ناول میں زید اعلیٰ عرب حکمرانوں اور غیر ملکی تارکین وطن کی محفلوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو معاشرے میں مذہبی عقائد سے دوری کا باعث بنتی جا رہی ہیں۔

لوگ بے خبر ہو کر ناچ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں پینے کے جرم میں گرفتار کئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اکثر ان میں سے خود ڈرائیو کر کے اپنے ٹھکانوں کو جاتے۔۔۔ تب بھی نہیں ۔ایک سفید آدمی نے، جو قد میں دوسروں سے نسبتاً مختصر تھا۔۔۔ کم عمر عورت کے جو تھک کر بیٹھ گئی تھی، جوتے اتارے اس کے پیروں کو پیار کیا۔۔۔ جیسے ان کی تھکن اتار رہا ہو۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر کا عرب جسے فلسطین میں جا کر لڑنا چاہیے تھا، یا مصطفیٰ، یا مصطفیٰ گا گا کر ناچ رہا تھا۔ اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔۔۔ یہی نہیں نہ میں نے کبھی سفید آدمی کا ہاتھ کاٹے جاتے دیکھا ہے، نہ سر، رہے شراب بنانے والے امریکی انھیں کبھی کوڑے بھی نہیں پڑتے ہیں۔ "[۱۵]

زید اپنے گھٹن زدہ معاشرے کی اخلاقی زوال کی قدروں، مادیت پرستی اور تضادات سے بھرپور کلچر سے بیزار ہے۔ جس نے عرب ممالک کی تمام روایتی و تہذیبی اور مذہبی اقدار کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ زید اپنے معاشرے میں موجود ان عرب کرداروں اور غیر ملکی تارکین وطن کے رویوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ جنہوں نے معاشرے میں موجود لوگوں کو جنسی بے راہ روی، مذہبی عقائد سے دوری اور ذہنی پراگندگی سے دوچار کیا ہے۔ ناول میں زید اپنے ملک کے ایک علاقے کی بے راہ روی کا ذکر یوں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ب خلیج اور بحیرہ احمر کے درمیان کی عرب دنیا کا حصہ ہے لیکن یہاں نہ شراب بیچنے پر کوڑے پڑتے ہیں نہ پینے پر۔ اگر صحیح رابطہ ہو جائے تو یہاں شراب سے بھی تند کئی اور نشے میسر ہیں اور نہ ان کے لیے کسی کا سر کاٹا جاتا ہے نہ چوری پر ہاتھ۔۔۔ لڑکیاں ہیں جو کہربائی چیزوں کی طرح مہنگی سے مہنگی لے کر سستی سے سستی قیمت کی ملتی ہیں۔ ہر رنگ کی۔۔۔ ہے نا عش عش کرنے کی بات کہ اس دنیا میں امریکی اثر اتنا ہے۔۔۔ یہاں ہر چیز امریکا کی رضا سے ہے۔"[۱۶]

حسن منظر کے ناول العاصفہ میں زید کا کردار عرب ملک کی معاشرت کا ایسا نمائندہ دکھایا گیا ہے جو سماج میں تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم سے غیر ملکی تارکین وطن کی اجارہ داری، اعلیٰ افسران کے اثر و رسوخ، امیر غریب کے فرق اور اخلاقی تفاوت کے تصورات کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عرب ممالک میں رہنے والے تمام افراد اپنی اپنی جگہ پر ملک و قوم کے لئے کام کریں۔ اور اپنی روایات و اقدار کی ساکھ اور ذمہ داریوں کو خود سنبھالیں تاکہ انہیں غیر ملکی تارکین وطن سے ذلیل نہ ہونا پڑے۔ ناول میں موجود زید کا کردار اپنے عرب ملک کی موجودہ صورتحال کی وجہ سے فرسٹریشن کا شکار ہے۔ وہ معاشرے میں تبدیلی کا نعرہ بلند کرتا ہے لیکن خود عمل سے محروم دکھائی دیتا ہے

مذہبی عقائد سے دوری کی صورتحال ہمیں ناول بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کے کردار میں بھی نظر آتی ہے۔ جب یہ کردار جرمنی سے جبری نقل مکانی کرتے ہوئے ہالینڈ سکونت اختیار کرتا ہے۔ بیرون ملک میں یہ کردار خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرتے ہوئے دوسروں میں محبت اور توجہ کا متلاشی دکھائی گیا ہے۔ اپنے والدین سے دوری، مذہبی عقائد کے معدوم ہونے کے خطرات ناول میں موجود ربیکا کے کردار کو اذیتوں اور عذابوں میں مبتلا کئے رکھتے ہیں۔ ان تمام اذیتوں اور عذابوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ربیکا کا کردار ایک ایسے ہمسفر کی خواہش کرتا ہے جو اسے محبت و آسودگی دے کر اس کے روح کی مضطرب و بے چینی کو ختم کر دے۔

ربیکا اسی ذہنی و جذباتی ناآسودگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر ایڈے یمی سے ناجائز تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر ایڈے یمی کی وقتی طور پر کی جانے والی محبت اس کے کردار میں کچھ لمحے سکون کا باعث بنتی ہے۔ اور ربیکا کو خوشی میسر ہوتی ہے کہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ اپنی اسی خوشی کا اظہار ربیکا جب ڈاکٹر ایڈے یمی سے کرتی ہے تو وہ اسے بچہ نہ پیدا کرنے کا کہتا ہے۔ اور ایک دن اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ ناول میں ربیکا ڈاکٹر ایڈے یمی کی بے وفائی کا ذکر راوی سے یوں کرتی ہے۔

> جس دن میں نے اسے بتایا، ٹوودر آج میں تمہیں ایک خوشخبری سناتی ہوں، چھوٹا ٹوودر ایڈے یمی میرے پیٹ میں پل رہا ہے۔ اس کا منھ لٹک گیا اور کافی دیر تک وہ کچھ بولا نہیں۔ میں نے کہا، کیا سوچ رہے ہو؟ اس نے کہا، میرا خیال تھا تم اس عمر سے نکل چکی ہو۔ میرا جی کٹ کر رہ گیا۔۔۔ وہ مجھ پر زور دیتا رہا کہ میں بچے کو نکل دوں۔ ابھی چند ہفتوں کا ہے۔۔۔ اس کی جسارت سنو مجھ سے کہتا ہے "تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ جیسے صرف جسمانی تکلیف ہی تکلیف ہوتی ہے۔ جذبات کی تکلیف کوئی تکلیف نہیں ہے۔"[۲۲]

ناول میں ڈاکٹر ایڈے یمی کے اچانک چھوڑ کر جانے کے بعد ربیکا کا کردار جس خلا کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اس کی پوری زندگی پر اثر انداز رہتا ہے۔ ڈاکٹر ایڈے یمی کے چھوڑ جانے کی وجہ سے ربیکا کی زندگی احساس گناہ اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ اپنے مذہبی عقائد سے دوری کا احساس ربیکا میں ذہنی انتشار کا سبب بن جاتا ہے۔

ربیکا چونکہ یہودی مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ نسلی اور مذہبی اعتبار سے دوسری قوموں سے برتر ہیں۔ یہودیوں کی مذہبی بنیاد دراصل نسل پر قائم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہودی النسل لوگ اپنی نسل اور مذہبی پیروکار کے سوا کسی دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والوں سے شادی نہیں کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے۔

بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کا کردار کا اپنے والدین سے بچھڑ جانے کے بعد کرسچین فیملی میں آجاتا ہے، پھر خود کو کرسچین اعتقادات سے دور رکھنے کی سعی کرنا، اپنے یہودی مذہب کے ساتھ نبھانے کی جستجو اور اپنے اندر ابھرنے والے تضادات سے نبرد آزما ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ربیکا ان تضادات سے فرار حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر ایڈے یمی کی رفاقت قبول کرلیتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ایڈے یمی کی بے وفائی ربیکا کے کردار کو احساس گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے کہ اس نے اپنے مذہب کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اپنی انہی کیفیات کا ذکر ربیکا ناول کے راوی سے یوں کرتی ہے۔

> اس صبح کے بعد میں مغموم رہنے لگی۔ لیکن جب خود سے بیزاری حد سے زیادہ بڑھی تو میں نے فیصلہ کیا مجھے بھی اقرار خطا کرنا چاہیے۔ اور چونکہ یہاں کوئی سائیکو تھیراپسٹ نہیں ہے تو اس کام کے لیے کیتھولک فادر سے بہتر کون ہو سکتا تھا جو اقرار گناہ سننے کے لیے ہی دنیا میں آتا ہے ---- تمھیں میں یہ حادثہ--- میں حادثہ ہی کہوں گی--- نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ تم میری زندگی کے ایسے تین چار واقعے سن چکے ہو اور سوچتے ہوگے کہ بار بار میں ایک ہی پتھر سے ٹھوکر کیوں کھاتی ہوں---[۴۳]

ناول میں ربیکا اپنی زندگی کے زخموں کو کرید کرید کے راوی کے سامنے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ راوی ربیکا کی زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنے اذیت اور کرب ناک ماضی کو بھول کر آگے بڑھ جائے۔ تب ہی وہ اپنی زندگی کی تمام تلخیوں سے چھٹکارا پا سکتی ہے۔ ناول کا راوی ربیکا کی تشفی کے لیے اسے مایوسی، اداسی اور احساس جرم کے پچھتاوے سے نکالنے کے لیے دلاسے دیتا ہے۔ ناول میں موجود راوی کا کردار ربیکا کی ذہنی کونسلی یوں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> اس کے تھوڑے بہت الفاظ استعمال کرتا ہوا میں اس کے کڑوے بادام کے سے احساس گناہ کو نگلنے کے لائق بنا رہا تھا اور یہ وہ کام تھا جسے نہ کیتھولک فادر جورڈن کر سکتا تھا نہ ریورینڈ جیمس ہوویل، نہ کوئی مالم (مسلم) امام مسجد نہ مدر فلوینا---- میں نے کہا، تمھارا ضمیر ایک راکشس ہے (جس کے معنی وہ جانتی تھی) ہر لمحے تمھیں کھاجانے کو تیار۔ جن کے کندھوں پر اس راکشس کا بوجھ نہیں ہوتا ہے، بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں اچھا برا کچھ نہیں جانتے، اسے اتار پھینکو--[۴۴]

حسن منظر کے ناول بیر شیبا کی لڑکی میں نسلی تعصب کا حوالہ بھی موجود ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ربیکا یہودی النسل سے تعلق رکھتی ہے۔ نسلی تعصب کے حوالے سے وہ اپنے ذاتی تجربات بیان کرتی ہے جب وہ امید سے تھی۔ اس کا بوئے فرینڈ ڈاکٹر ایڈے یمی ایک سیاہ فام تھا۔ ربیکا کے امید سے ہونے پر وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور جب ربیکا کا بچہ بڑا ہونے پر اپنے رنگ و نسل اور باپ کے بارے میں سوالات کرتا ہے تو یہاں ربیکا کا کردار ایک پھر سے دوہرے عذاب میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔

> جب ڈیوڈ نے میری باتوں کو سمجھنا شروع کیا تھا اور اپنے باپ کے بارے میں پوچھنا اور جب اپنے رنگ کا مجھ سے مختلف ہونے کا اسے احساس ہونے لگا۔ ایک دن اس نے اسکول سے آکر مجھ سے پوچھا تھا۔ یہ ایڈے یمی کون شخص ہے۔ کسی بچے کے باپ کا نام ایسا نہیں ہے۔۔۔۔ کب تک میں اس اذیت کو جھیل سکتی ہوں۔[۲۵]

ناول میں موجود ربیکا اپنے ضمیر کی اس آواز سے تنگ ہے جو غیر یہودی النسل سے تعلقات قائم کرنے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ اپنے مذہبی عقائد سے دوری ہی ربیکا کے کردار میں داخلی ٹوٹ پھوٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی زندگی ایک بار پھر سے خلاؤں میں بھٹکنے لگتی ہے۔

ناول میں ربیکا کا کردار دربدر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ منصف نے ناول میں ربیکا کے کردار کا تعلق بیر شیبا سے دکھایا ہے۔ جو دراصل فلسطین کی سرزمین کا ایک حصہ ہے۔ اس سرزمین کے بارے میں یہودیوں کا نظریہ یہ ہے کہ فلسطین کی سرزمین ان کے لیے مذہبی نقطہ نظر سے اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اسی سرزمین پر بنی اسرائیل کے بے پناہ انبیاء کرام نازل ہوئے۔ حسن منظر نے ناول بیر شیبا کی لڑکی کا لوکیل اسی مذہبی نقطہ نظر کو بنایا ہے۔ جہاں یہودیوں نے بنی اسرائیل کے پیغمبروں پر ظلم کئے۔ اسی وجہ سے انہیں سزا ملی اور یہ یہودی صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی دربدری کی زندگی جی رہے ہیں۔ ناول میں منصف نے wandering jews کی اصطلاح انہی کے لیے استعمال کی ہے، جس کا مطلب ہے دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودی۔ ناول میں ربیکا کا کردار انہی یہودیوں کی دربدری کی زندگی کو بیان کرتا ہے۔

مذہبی عقائد سے دوری کی صورتحال ناول انسان، اے انسان میں تلمیذ کے کردار میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ تلمیذ کی راجدھانی کی جانے والی ترک سکونت اور پھر راجدھانی میں پیش آنے والے حالات و واقعات اس کی زندگی میں مزید بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں۔ بہن اور بہنوئی کے گھر کا سخت ماحول، بہنوئی کی مار پیٹ، اور بہن کا اس

کے ساتھ لیا دیا سلوک ہی تلمیذ الرحمن کی زندگی میں بے راہ روی کو پیدا کرتا ہے۔ وہ گھر کے ایسے ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لیے باہر کی دنیا میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ گھر میں کی جانے والی بدسلوکی اور پیٹ کی بھوک ہی تلمیذ الرحمن کے کردار میں مذہبی عقائد سے دوری کا باعث بنتی ہے۔ مذہبی روایات و اقدار سے دوری ہی تلمیذ جوئے جیسے کھیل سے روشناس کرواتی ہے۔ اور وہ جوئے سے پیسے جیت کر اپنی بھوک مٹاتا ہے۔ تلمیذ الرحمن کو یہ احساس بھی ستانے لگتا ہے کہ جوا ایک گناہ ہے اور وہ گناہ کی زندگی کا عادی ہو رہا ہے۔ لیکن جلد ہی وہ اس احساس پر قابو پاتے ہوئے اس کا الزام اپنے باپ پر ڈال دیتا ہے۔ ناول سے اقتباس

> قبروں کے بیچ میں کی ایک خالی جگہ جہاں کی قبریں بیٹھ گئی تھیں۔ وہاں چار چھ آدمی خاموشی سے بساط بچھائے بیٹھے ہوتے تھے۔۔۔۔۔۔ دو آدمی بیٹھے پورے وقت بیڑی پیتے رہتے تھے، تیسرے کے ہاتھ میں گڑگڑی ہوتی تھی۔۔۔ بیڑی کی تیز بو اور ان کے کپڑوں کی بدبو پھیلی ہوتی تھی۔ پہلے دن تلمیذ کو دلچسپی سے کھیل دیکھتے ہوئے ایک نے پوچھا" آتا ہے؟" ہاں۔۔۔۔۔ اس دن تلمیذ وہاں سے سترہ پیسے لے کر اٹھا۔۔۔ چند ہی دن میں اس کی طبیعت گناہ سے بھر گئی۔ پھر اس نے خود کو سمجھایا اگر یہ گناہ ہے تو ابا مجھے علیحدہ سے جیب خرچ کیوں نہیں بھیجتے۔۔۔۔۔ یہ گناہ ان کے سر ہے۔[۲۶]

کچھ عرصے بعد تلمیذ کے والد فالج کے حملے سے جان بحق ہو جاتے ہیں۔ وہ گھر جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے اور کاروبار کے تمام معاملات پر تایا عزیز الرحمان قابض ہو جاتے ہیں۔ یہاں منصف نے تلمیذ الرحمن کے تایا کے کردار کے ذریعے سے ان لوگوں کی عکاسی کی ہے جو بظاہر مذہبی اور دین کی رغبت میں سرگرم رہتے ہیں۔ اور خود ان کی زندگی مذہبی و دینی عمل سے دور دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں تلمیذ کے والد کے انتقال کے بعد تایا کے کردار میں رعونت جنم لیتی ہے۔ اور وہ اپنے بھائی کے بچوں کو ان کے وراثت کا حصہ دینے میں ٹال مول سے کام لیتے ہیں۔ پھر بیٹیوں کو ان کے وراثت کا حصہ دینے سے انکار کرتے ہوئے وہ تلمیذ الرحمن کو پڑھائی کے خرچے کی صورت میں حصہ دیتے رہتے ہیں۔ بعد میں یہ خرچا بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ ادھر تلمیذ کی بہن اور بہنوئی وراثت میں حصہ نہ ملنے کی وجہ سے تلمیذ الرحمن کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

انسان، اے انسان میں تلمیذ فسادات کے باعث پاکستان آجاتا ہے تو اس کی ملاقات غیور نامی جرنلسٹ، شان الہی کلرک، مرتضیٰ جیسے وکیل سے ہوتی ہے۔ یہ کردار معاشرے میں اخلاقی تفاوت کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ تلمیذ جہاں پہلے ہی یہ جان جاتا ہے کہ گناہ چھپ کر کرنے کی چیز ہے۔ ان کے ساتھ مل کر غلط کاموں میں ملوث

ہو جاتا ہے۔ناول میں موجود یہ کردار ہی تلمیذ الرحمن کو جیل تک پہنچا دیتے ہیں۔اور پھر تلمیذ الرحمن کی رکھیل امینہ اسے جیل کے باہر نکلوانے میں مدد کرتی ہے۔

تلمیذ الرحمن اپنی ایسی زندگی اور خود سے بیزار سا رہتا ہے۔وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں شادی کر لینے کا ارادہ کرتا ہے۔اور وہ سوچتا ہے کہ اپنی زندگی کی تمام تلخیوں اور محرومیوں کو وہ ایک بیوی اور گھر کی صورت ہی میں بھلا سکتا ہے۔ذہنی و روحانی سکون کی تلاش ہی تلمیذ الرحمن کو شادی کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔تلمیذ الرحمن اپنی شادی کا ذکر امینہ سے یوں کرتا ہے۔

> ایک دن باوجود ضبط کرنے کے وہ پوچھ ہی بیٹھی تھی، تم اتنے پریشان کیوں نظر آتے ہو؟ تلمیذ خاموش رہا۔ اس کا سگریٹ جلتے جلتے پوروں تک پہنچ چکا تھا۔۔۔تمہاری انگلیاں جل جاتی، اتنے کھوئے ہوئے کیوں رہتے ہو؟۔۔۔میں نے عہد کر لیا ہے اب گناہ کی زندگی چھوڑ دوں گا۔ چونک کر امینہ نے کہا، یعنی میرے کو۔ میں اب اپنی زندگی درست کرنے کے پھیر میں ہوں۔مجھے سی بھی نہیں ملو گے میں تمہارا گناہ ہوں۔۔۔میں اس دوڑ بھاگ کی زندگی سے تھک چکا ہوں۔مجھ سے ملتے رہو گے ؟ نہیں شادی کر رہا ہوں۔ہو سکے تم بھی شادی کر لو۔[۲۲]

میمونہ سے شادی جہاں تلمیذ الرحمن کے لیے سکون اور امن کا سبب بنتی ہے۔وہیں ملک اور گھر کے روز بروز بگڑتی معاشی صورتحال اس کے کردار کو ایک بار پھر سے اخلاقی پستی کی طرف راغب کر دیتی ہے۔وہ گھریلو حالات اور ذمے داریوں سے تنگ آ کر جوئے سے پیسہ کمانا شروع کر دیتا ہے۔اور وہ گھر جو میمونہ کی وجہ سے مکمل اور محبت ذدہ لگتا تھا وہاں اب وہ اپنے دوستوں کو بلاتے ہوئے جوئے کا اڈا بنا دیتا ہے۔

ناول میں منصف نے ایک نو عمر بچے کا کردار بھی تخلیق کیا ہے۔یہ کردار دراصل تلمیذ الرحمن کے بیٹے کا کردار ہے۔جو اپنے باپ کے ہر پل بدلتے رویوں کو دیکھتا ہے تو ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔اپنے باپ کو ایک جواری اور شرابی کی زندگی بسر کرتے دیکھ کر اس کردار کے اندر غصہ جنم لیتا ہے۔اسی غصے کے سبب ہی وہ گھر چھوڑ دیتا ہے۔ بعد میں یہ کردار خود سڑک پر رہنے والے نشہ کر والوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔اور ایک دن اس کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے

یہاں منصف نے تلمیذ الرحمن کے بیٹے کے کردار کے ذریعے سے ان نو عمر بچوں کی ذہنی نفسیات کا مشاہدہ بھی کیا ہے جو گھر کے ایسے گھٹن ذدہ ماحول سے تنگ آ کر باہر کی دنیا میں سکون ڈھونڈتے ہیں۔ناول انسان! اے انسان میں نجم کے کردار کے بارے میں انوار احمد لکھتے ہیں کہ " سارا مسئلہ یہ ہے کہ حسن منظر جیسے آئیڈیلسٹ نے

کس طرح گوارہ کیا کہ " خدا کی بستی " سے کسی قدر مختلف دنیا میں سانس لیتے اس بچے کو راجہ، نوشا اور شامی سے بھی بدتر انجام کی طرف جانے دے اور اس کے لئے کوئی بڑا فنی اہتمام بھی نہ کرے۔"[۲۸]

بیٹے کی موت کا ذمہ دار میمونہ تلمیذ الرحمن کو سمجھتے ہوئے اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔ وہیں تلمیذ الرحمن کی ملاقات ایک سیاسی وڈیرے سے ہوتی ہے جو تلمیذ کو کسی کے قتل کرنے کی سپاری دیتا ہے۔ تلمیذ الرحمن کا قتل سے انکار اسے واپس جیل بھجوا دیتا ہے۔ وہاں یہ کردار ماضی کی یادوں میں کھو کر اپنی زندگی کی تلخیوں کو یاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں اس کے پاس احساس ندامت کے سوا کچھ نہیں بچتا ہے۔ یہی احساس ندامت تلمیذ الرحمن کو صلوۃ کا پابند بناتا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اب یہ کردار پشیمان ہونے کے ساتھ ساتھ اب راہ راست پر آگیا ہے۔ لیکن جب کچھ سیاسی قیدیوں کے لیے جیل توڑی جاتی ہے یہ کردار بھی فرار ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حسن منظر نے ایسے ناول تخلیق کیے ہیں جن کی کہانیاں پڑھنے والے پر فکر و شعور کے نئے دریچے کھول دیتے ہیں۔ سیاسی جبر و استحصال، منافقت پر مبنی سماج، معاشرتی ناہمواریاں، احساس کمتری کا شکار لوگ، جنسی پامالی، حسد، عدم برداشت، فرسودہ رسوم و رواج، بھوک، افلاس اور بے روزگاری ہمارے معاشرے کے سنگین مسائل ہیں۔ حسن منظر کے ناولوں کے کردار انہی مسائل سے نبرد آزما ہوتے نظر آتے ہیں۔

حسن منظر ایک ایسے ناول نگار ہیں جو اپنے مشاہدے کی گہرائی سے نہ صرف انسان کے باطن کی گرہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کا مشاہدہ انسان اور زندگی کے بارے میں بہت وسیع اور گہرا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ناول ان کی زندگی کے ذاتی تجربات، معاشرتی زندگی کے مسائل اور انسانی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات جن کا تعلق کسی بھی شعبے سے کیوں نہ ہو، اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں۔ یہی نہیں وہ تمام واقعات کو پوری جزئیات اور منظر نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ان کے تمام کردار ہی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ منصف کا تعلق چونکہ شعبہ نفسیات سے ہے اس لیے وہ ایک کامیاب ماہر نفسیات کی طرح معاشرے کے باطن میں اتر کر ارد گرد کے ماحول میں موجود برائیوں کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ان مسائل ہی کو وہ اپنی تحریروں میں حقیقت کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو معاشرے میں پریشانیوں اور اخلاقی زوال کا سبب بن رہی ہیں۔ اس طرح منصف کے کردار معاشرے کے گھناؤنے چہروں قاری کے سامنے بے نقاب کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ حسن منظر،دھنی بخش کے بیٹے (کراچی: شہزاد پبلشرز،۲۰۰۸ء)، ص۳۵۷۔

۲۔ ایضاً،۳۵۸۔

۳۔ ایضاً،۳۴۶۔

۴۔ ایضاً،۳۶۷۔

۵۔ مسکین احمد منصور، اشکوں میں رعنائی، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد۱۹، شمارہ مئی جون، ۲۰۱۰ء، فیض الاسلام، پریس ٹرنک بازار، راولپنڈی، ص، ۳۶۔

۶۔ حسن منظر، العاصفہ (کراچی: شہزاد پبلشرز،۲۰۰۶ء)، ص ۲۲۔

۷۔ ایضاً،۷۔

۸۔ ایضاً،۱۷۴۔

۹۔ مہرونہ لغاری، حسن منظر کی ادبی خدمات (فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۴ء)، ص ۲۱۸۔

۱۰۔ حسن منظر، دو مختصر ناول (کراچی: شہزاد پبلشرز،۲۰۱۰ء)، ص ۴۶۔

۱۱۔ حسن منظر، انسان، اے انسان (کراچی: شہزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء)، ص ۸۹۔

۱۲۔ ایضاً،۱۰۳۔

۱۳۔ ایضاً،۱۷۵۔

۱۴۔ حسن منظر، انسانیت کا تابوت، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد۱۹، شمارہ مئی جون، ۲۰۱۰ء، فیض الاسلام، پریس ٹرنک بازار، راولپنڈی، ص، ۵۲۔

۱۵۔ حسن منظر، حبس (کراچی: شہزاد پبلشرز،۲۰۱۴ء)، ص ۳۴۔

۱۶۔ ایضاً،۴۶۔

۱۷۔ ایضاً،۲۸۔

۱۸۔ ایضاً،۴۳

۱۹۔ حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص ۳۹۳۔

۲۰۔ حسن منظر، العاصفہ، ص ۱۳۹۔

۲۱۔ ایضاً، ۱۰۴۔

۲۲۔ حسن منظر، دو مختصر ناول، ص ۲۰۔

۲۳۔ ایضاً، ۴۴۔

۲۴۔ ایضاً، ۵۰۔

۲۵۔ ایضاً، ۶۸۔

۲۶۔ حسن منظر، انسان، اے انسان، ص ۴۱۔

۲۷۔ ایضاً، ۳۵۴۔

۲۸۔ انوار احمد، افسانے، "ناول کی فضیلت اور حسن منظر کا انسان، اے انسان" مشمولہ پیلھوں، شمارہ ۴/ اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۳ء، ملتان۔

ماحصل

ماحصل

تاریخ عالم کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ترک سکونت کا عمل ایک مسلسل سفر کی صورت میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ترک سکونت انسان کی سرشت کا حصہ ہے۔ دنیامیں موجود ہر بنی نوع انسان، چرند پرند، حیوانات اور نباتات ترک سکونت کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ آج کے دور کے انسان کو جن بنیادی مسائل کا سامنا ہے، ان میں ایک اہم مسئلہ ترک سکونت بھی ہے۔ انسان اپنی ضروریات زندگی کی تگ و دو میں، آرائش زندگی کی فراہمی کے لئے یا پھر حصول تعلیم کی تکمیل کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ سکونت اختیار کرتا ہے۔ یوں انسان کو خوب سے خوب تر خواہشیں ہی ترک سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کرتیں ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسان کئی مجبوریوں کی وجہ سے بھی ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان مجبوریوں کی جو اہم وجوہات سامنے آتیں ہیں ان میں مذہبی، سیاسی اور معاشی وجوہات سر فہرست ہیں۔

اردو ادب میں ترک سکونت کا حوالہ تقریباً تمام اصناف نثر میں ملتا ہے۔ دیگر اصناف نثر مثلاً داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ میں ترک سکونت کا بیانہ ابتدا ہی سے موجود دکھائی دیتا ہے۔ داستانوں میں میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب میں ترک سکونت کے مباحث کے ساتھ ساتھ قاری کو اس عہد کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

جہاں تک ناول اور افسانے کی بات ہے تو ان میں ترک سکونت کے مباحث کا باقاعدہ طور پر اظہار تقسیم ہند اور سقوط ڈھاکہ کے بعد زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ جب قافلوں کے قافلے اپنی آبائی سر زمینیں چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ کسی دوسرے ملک میں نئے سرے سے آباد ہونا، ان تارکین وطن کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ یوں نئے ماحول، اجنبیت، اجنبی لوگوں سے واسطہ، اپنی سر زمینوں سے دوری، اپنی روایات و اقدار اور رشتوں سے جدائی کا غم ہی ترک سکونت کے بیانیے میں تشکیل پایا۔ اور اس عہد کے لکھے گئے ادب میں کرداروں کی گفتگو اور سوچوں کا محور ترک سکونت کے مباحث بنے۔

اردو ناول میں ترک سکونت کا اظہار ابتدا ہی سے موجود دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تقسیم ہند، سقوط ڈھاکہ اور موجودہ دور کے حالات و واقعات کے بعد ترک سکونت کی کئی صورتیں زیادہ مربوط انداز میں ترتیب پاتی رہی ہیں ۔اس حوالے سے اردو ناول میں ترک سکونت کی کئی صورتوں کا اظہار قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، خدیجہ مستور،

انتظار حسین، الطاف فاطمہ، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ اور دیگر ناول نگاروں کے ناولوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس میں ان ناول نگاروں کے ہاں یہ خیال بار ہا طور پر سامنے آتا ہے کہ انسان کی جنم بھومی ہی اس کا اصل وطن ہے۔ اپنے وطن یعنی خمیر سے دوری تارکین وطن کو ذہنی و روحانی طور پر متاثر کرتی ہے۔ یوں ان تمام ناول نگاروں کے ناولوں میں ترک سکونت کا موضوع ایک قدر مشترک کے طور پر سامنے آتا ہے۔

حسن منظر اکیسویں صدی کے ایک ممتاز تخلیق کار ہیں۔ وہ اردو ادب میں اپنے منفرد انداز تحریر اور شناخت کی وجہ سے ایک معتبر حوالہ رکھتے ہیں۔ حسن منظر کی کئی ادبی جہتیں ہیں۔ وہ پاکستان کے مشہور ناول نگار، افسانہ نگار، مترجم اور ماہر نفسیات بھی ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو العاصفہ، دھنی بخش کے بیٹے، دو مختصر ناول ، بیر شیبا کی لڑکی، ماں بیٹی ، وبا، حبس، انسان، اے انسان اور اے فلک نا انصاف جیسے شہرہ آفاق ناول دیئے ہیں۔

عہد حاضر میں حسن منظر کے یہی ناول ترک سکونت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ترک سکونت کے مباحث کو اپنے ناولوں میں برتا ہے۔ ان کے ناولوں میں سیاسی و سماجی اور معاشرتی مسائل کے بیان ہی دراصل انسانی زندگیوں کو ترک سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ حسن منظر کے ناولوں میں کی جانے والی ترک سکونت کہیں مثبت تو کہیں منفی اثرات کے طور پر سامنے آتی ہے۔

اس مقالے کے پچھلے ابواب میں ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کے بحران کے حوالے سے حسن منظر کے تقریباً تمام ناول ہی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اور انہی تناظر میں ان کے ناولوں میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا حسن منظر کے ناول ترک سکونت کے مباحث اور شناخت کے بحران کی عکاسی کرتے ہیں یا نہیں۔ موضوع کی ضرورت و اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد جن سوالات پر رکھی گئی ہے۔ وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کی صورتیں کیا ہیں؟

۲۔ حسن منظر کے ناولوں میں شناخت کے بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار کس طرح کیا گیا ہے؟

۳۔ حسن منظر کے ناولوں میں کرداروں اور واقعات کے ذریعے سے تارکین وطن کی تہذیبی و ثقافتی مسائل کی عکاسی کیسے کی گئی ہے؟

ان سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مقالے کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ اور ہر ممکنہ کوشش کی گئی ہے کہ ترک سکونت کے تناظر میں ان تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات تلاش کیے جا سکیں۔

تارکین وطن کو درپیش مسائل کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ترک سکونت کے مباحث کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقمہ نے مقالے کے پہلے باب میں ترک سکونت کی تعریف، تعارف اور اہمیت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مختلف اردو اور انگریزی کی لغات کی مدد سے ترک سکونت کے معنی و مفاہیم دیکھ یہ جا سکتا ہے کہ ترک سکونت کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اپنی آبائی سرزمینوں کو خیرباد کہتے ہوئے کسی نئی جگہ آباد ہو جاتے ہیں۔

ترک سکونت اختیار کرنے کی کئی صورتیں ہوتیں ہیں، جن کی وجہ سے تارکین وطن اپنے ملک اور علاقوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ان تارکین وطن کے ہاں اپنے ملک اور علاقوں کو چھوڑنے کی بنیادی صورتیں زیادہ تر سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل کے طور پر سامنے آتیں ہیں۔ انہی مسائل کی بدولت جب تارکین وطن بیرون ممالک کا رخ کرتے ہیں تو انہیں وہاں دیگر سماجی و معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کا حوالہ کئی سطحوں پر تشکیل پاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ترک سکونت انسان کی زندگی، اُس کی نفسیات، ذہن اور قلب پر جو اثرات مرتب کرتی ہے، تارکین وطن ساری عمر اُن اثرات سے چھٹکارا نہیں پا سکتے ہیں۔ یہی اثرات تارکین وطن میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور شناخت کے بحران کا سبب بنتے ہیں۔ حسن منظر کے ناولوں کے کردار ترک سکونت کے نتیجے میں ذہنی دباؤ کا شکار اور تشویشناک کیفیات میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے کرداروں کے ہاں ترک سکونت کے جن نفسیاتی پیچیدگیوں کے مسائل کو بیان گیا ہے۔ ان میں شناخت کے بحران کا مسئلہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے کرداروں میں شناخت کے بحران کا مسئلہ تارکین وطن میں موجود کی گمشدگی، کمپلیکس، کنفیوژن اور بے زمینی کے کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ شناخت کی نفی ہی فرد کی ذات کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اور اپنی ذات کی گمشدگی ہی تارکین وطن کی ذہنی صلاحیتوں کو داخلی، خارجی، شعوری اور لاشعوری طور پر بری طرح متاثر کرتی ہے۔ شناخت کی نفی ان کے کرداروں میں اپنی زمین سے بے جڑ ہونے کے احساس، عزیز و اقارب سے دوری، داخلی شکست وریخت اور ذہنی انتشار کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

حسن منظر کے ناولوں کے کردار جب بیرون ممالک مقیم ہوتے ہیں تو وہ خود کو وہاں اجنبی اور تنہا محسوس کرتے رہتے ہیں۔ تارکین وطن میں شناخت کا بحران اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار زیادہ اس صورت میں نمایاں ہوتا ہے جب انہی تارک وطن کو اپنی سرزمین اور جنم بھومی سے دوری کا احساس ستانے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں کے کردار

نئی سرزمین اور نئے ملک میں خود کو ضم کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو یہی کردار متزلزل ہونے پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

حسن منظر اپنے ناولوں میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ہر ملک و قوم کے پاس اپنا ایک تہذیبی و ثقافتی سرمایہ موجود ہوتا ہے۔ جو اس ملک میں رہنے والوں کی شناخت اور پہچان کا باعث بنتا ہے۔ تارکین وطن جب بیرون ممالک سکونت اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار سے دور ہو جاتے ہیں۔ اپنی روایات و اقدار سے دوری ہی ان تارکین وطن میں شناخت کے بحران کا نمایاں کرتی ہے۔ اور جب بیرون ممالک مقیم تارکین وطن اپنا تہذیبی تشخص کھوتے ہیں تو احساس کمتری، عدم تحفظ، کرب، خوف، مایوسی، تنہائی، ذہنی و جسمانی کوفت اور نفسیاتی و روحانی پیچیدگیوں کے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ترک سکونت کا ایک اور حوالہ ان کے کرداروں میں ذہنی اور باطنی خلا کی صورت میں تشکیل پاتا ہے۔ منصف کے ناولوں کے کردار ساری عمر بیرون ممالک کو اور نئی سرزمین کو قبول نہیں کر پاتے ہیں۔ اس لیے ان کے کرداروں کی گفتگو اور سوچوں کا محور ماضی کی یادیں بن جاتیں ہیں۔ وہ اپنی ماضی میں گم ہو کر اپنے ملک کے بارے میں، وہاں گزرے اپنے حالات و واقعات کے بارے میں سوچتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیرون ملک کی اجنبی اور اکیلے پن کی زندگی انھیں ماضی کی طرف مراجعت پر مجبور کر دیتی ہے۔

حسن منظر کے ناولوں کے زیادہ تر کردار جبری نقل مکانی کرنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار جبری نقل مکانی کی صورتوں کو کبھی بھی بھلا نہیں پاتے ہیں۔ منصف کے ہاں ترک سکونت اختیار کرنے کی صورتیں چاہے کچھ بھی رہی ہوں۔ وہ تارکین وطن کو نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیتیں ہیں۔ اور ترک سکونت کا کرب ان کے کرداروں میں داخلی سطح پر تارکین وطن کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ نئی سرزمین میں آباد ہو جانے کے باوجود ان کے کردار نئے ماحول میں خود ایڈجسٹ نہیں کر پاتے ہیں۔ اور ان کا ایک نئے ماحول اور نئی تہذیبی میں آبسنا مشکل ترین امر ثابت ہوتا ہے۔

منصف کے ناولوں میں تارکین وطن میں نفسیاتی مسائل کی ایک اور صورت ماضی اور حال کی کشمکش کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس صورت میں حسن منظر کے کردار میں اپنے حال اور اور گرد کے حالات و واقعات سے بیزار ہو کر ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ماضی اور حال کی کشمکش انھیں بیرون ملک اور

اپنے ملک کا تقابل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔یوں بیرون ممالک مقیم تارکین وطن شعوری اور لاشعوری طور پر دونوں ممالک کا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ اور دو ملکوں کا تقابل ہی ان کے کرداروں میں اقدار کے تضاد کو جنم دیتا ہے۔

حسن منظر کی ادبی جہات کا مرکزی نقطہ نظر ترک سکونت اور تارکین وطن کے مسائل ہیں۔ چونکہ ان کے تقریباً تمام ناولوں کا موضوع اپنی جنم بھومی سے دوری اور اپنی تہذیب و ثقافت کے نابود کے کرب کو بیان کرتا ہے ۔دھنی بخش کے بیٹے میں احمد بخش کا مرکزی کردار ترک سکونت کے تجربے سے گزر کر دیہات سے شہر اور شہر سے امریکہ سکونت اختیار کرتا ہے۔وہ وہاں اپنی روایات و اقدار کو کچھ خاص نہیں جانتا ہے۔ لیکن اس کا ذہین شعوری اور لاشعوری طور پر امریکا اور پاکستان کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کا تقابل کرتا ہے تو ماضی اور حال کی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔اسی طرح منصف کے ناول العاصفہ میں زید کا کردار،دومختصر ناول، بیر شیبا کی لڑکی میں ربیکا کا کردار،ماں بیٹی میں کلیرس،حبس میں ایرک اورانسان، اے انسان میں تلمیذ الرحمن کا کردار بھی ترک سکونت کے تجربے سے گزرتے ہوئے جن دیگر ممالک کا رخ کرتے ہیں تو اقدار کے تضادات کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے ناولوں کے کردار تارکین وطن میں تہذیبی و ثقافتی کشمکش کو بھی بیان کرتے ہیں۔ بیرون ممالک مقیم تارکین وطن خود چاہئے جیسی بھی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ جب اپنی اولاد کو ایسی معاشرت میں جوان ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جہاں معاشرہ تہذیبی و ثقافتی اور اخلاقی لحاظ سے شکست و ریخت سے دوچار ہے ۔ تو پھر انہیں وہاں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ستانے لگتی ہے ۔وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے معاشرے کی روایات و اقدار عادات و اطوار اور رہن سہن سے خود کو بچا کر رکھیں ۔ جو اُن کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کے زوال کا سبب بن سکتے ہے ۔یوں بیرون ممالک مقیم تارکین وطن کی اپنی نسل نو میں روایات و اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات ان کی زندگیوں میں اضطرب و بے چینی، فکری انتشار اور روحانی کرب کے مسائل کو جنم دیتیں ہیں۔

مغربی ممالک میں شخصی آزادی اور لا دینیت کے فروغ کے باعث ہی تارکین وطن اپنے مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ تارکین وطن میں مغربی طرز زندگی، رہن سہن، زبان کی تبدیلیاں ان کو اپنی روایات و اقدار سے دور کر دیتی ہیں ۔اور وہ اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ دیار غیر میں تارکین وطن کو اپنی روایات و اقدار کی شکست و ریخت کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ نسل نو میں مغربی ممالک میں بڑھتے جنسی بے راہ روی اور لا دینیت اور تشدد کے واقعات کی وجہ سے ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور دیکھا جائے تو حسن منظر کے ناولوں میں ترک سکونت کے مباحث اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کئی متنوع صورتوں میں سفر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی وسماجی، اور معاشرتی عدم استحکام، بہتر مستقبل، تلاش روزگار، جیسی صورتیں ہی لوگوں کو ترک سکونت اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بیرون ممالک کی جانے والی ترک سکونت ہی تارکین وطن میں کلچر شاک کے مسائل، شناخت کے بحران، عدم تحفظ، احساس تنہائی، اپنی سرزمیں سے دوری، عزیز و اقارب اور رشتوں سے جدائی، اپنی تہذیب و ثقافت میں شکست وریخت، مذہبی عقائد سے دوری، احساس کمتری، یاد ماضی، کرب، جھنجھلاہٹ، اپنی نسل نو مختلف تہذیبوں کے تصادم و انجذاب، جنسی بے راہ روی اور اپنی نسل نو میں اپنی روایات و اقدار کے حوالے سے رد و قبول کی کیفیات انہوں ذہنی ونفسیاتی انتشار اور خلفشار میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

کتابیات

کتابیات

آغا،وزیر۔کلچر کے خدوخال ۔لاہور:علی پرنٹرز،۲۰۰۹ء۔

آغا،وزیر۔ہجرت انشائیہ۔کراچی: تخلیقی ادب عصری مطبوعات،۱۹۸۰ء۔

احمد،انوار۔افسانے،"ناول کی فضیلت اور حسن منظر کا انسان،اے انسان"مشمولہ پیلھوں،ملتان،شمارہ۴(اکتوبر تا دسمبر،۲۰۱۳ء)۔

احمد،غفور۔نئی صدی ،نئے ناول۔لاہور:کتاب سرائے،۲۰۱۴ء۔

احمد فیض،فیض۔پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش ۔لاہور:فیروز سنز،۱۹۸۸ء۔

احمد منصور،مسکین۔"اشکوں میں رعنائی"،مشمولہ ماہنامہ چہار سو،جلد۱۹،راولپنڈی،شمارہ(مئی جون،۲۰۱۲ء)۔

احمد،نبی۔اردو شاعری میں ہجرت پی ایچ ڈی اردو،وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون،سائنس اور ٹیکنالوجی،اسلام آباد،۲۰۱۳ء،

الحسن نیر،نور۔نور اللغات (جلد دوم)۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۱۷ء۔

الدین،فیروز۔فیروز اللغات۔فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۲۰۱۰ء۔

القرآن،سورۃ آل بقرہ،پارہ نمبر۲،آیت نمبر۲۱۸۔

القرآن،سورۃ النساء،پارہ نمبر۴،آیت نمبر۱۰۰۔

القرآن،سورہ الا عراف،پارہ نمبر۸،آیت،نمبر۲۴۔

القرآن،سورۃ الصفت،پارہ نمبر۲۳،آیت نمبر۹۹

القرآن،سورۃ اشعر ،پارہ نمبر۱۹،آیت نمبر۵۴،۵۳،۵۲۔

الماس،روبینہ۔اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار۔مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۲۰۱۲ء۔

بن منظور،محمد بن مکرم۔لسان العرب الجلالتاسح ۔بیروت:دار صاور،۲۰۰۹ء۔

جالبی،جمیل۔پاکستانی کلچر۔کراچی:مشتاق بک ڈپو،۱۹۶۴ء۔

حسن،سبط۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا ۔کراچی:ذکی سنز پرنٹرز،۲۰۰۷ء۔

حسین،عبداللہ۔اداس نسلیں۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء۔

حسین، انتظار۔بستی۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۶۴ء۔

حسین، انتظار۔ تذکرہ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء۔

حسین، انتظار۔آگے سمندر ہے۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء۔

حسین تارڑ، مستنصر۔ دیس ہوئے پردیس ۔سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور:۱۹۹۹ء۔

حسین تارڑ، مستنصر۔اے غزال شب۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء۔

خان، ممتاز احمد۔اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار۔لاہور:فکشن ہاوس پبلشرز،۲۰۱۲ء۔

دہلوی، سید احمد۔مرتبہ فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، چہارم۔لاہور:اردو سائنس بورڈ، طبع ششم،۲۰۱۰ء۔

دہلوی، سید احمد۔فرہنگ آصفیہ ۔جلد اول(ا تا ت)۔لاہور:مطبع وفاہ عام پریس،۱۹۰۵ء۔

سدید، انور۔"ڈاکٹر حسن منظر۔۔۔اردو کا انوکھا افسانہ نگار"مشمولہ ہفت روزہ ندائے ملت،لاہور، جلد ۴۰، شمارہ ۴۶(۱۳/۱۴)نومبر،۲۰۰۸ء)۔

سرہندی، وارث۔قاموس مترادفات۔لاہور:کاروان پریس دربار مارکیٹ،۱۹۸۶ء۔

سلطان، روبینہ۔تین نئے ناول نگار۔لاہور:دستاویز مطبوعات،۲۰۱۲ء۔

عبداللہ، سید۔کلچر کا مسئلہ ۔لاہور:عملی پرنٹنگ پریس،۱۹۷۷ء۔

عظیم، سید وقار۔داستاں سے افسانے تک۔کراچی:اردو اکیڈمی،۱۹۶۶ء۔

عنایت اللہ، محمد۔مترجم "کنز العرفان" ترجمہ القرآن الکریم۔اوکاڑہ:شعر القرآن منزل جناح روڈ، ۲۰۰۸ء۔

فرخی، آصف۔"اجنبی سرزمینوں سے"، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد نمبر ۱۹، شمارہ(مئی،جون ۲۰۱۰ء)۔

فرخی، آصف۔"حسن منظر کے دو مختصر ناول"مشمولہ کہانی گھر کتابی سلسلہ ۴/۳مرتب زاہد حسن(اپریل/ستمبر ۲۰۱۲ء)۔

قدسیہ، بانو۔شہر بے مثال۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء۔

قدسیہ، بانو۔حاصل گھاٹ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء۔

کریم، ارتضیٰ۔مرتب انتظار حسین ۔۔۔ایک داستان۔دہلی:ایجوکیشنل پبلش ہاوس،۱۹۹۹ء۔

گڑھی، محمد جوناـ مترجم "تفسیر ابن کثیر"، ترجمہ، القرآن الکریم۔لاہور:مکتبہ رحمانیہ اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ،۲۰۱۸ء۔
لغاری، مہرونہ۔حسن منظر کی ادبی خدمات۔فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۴ء۔
مبارک پوری، صفی الرحمن۔الرحیق المختوم۔لاہور:مکتبہ السلفیہ، س۔ن۔
محمود، سید قاسم۔مرتبہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔کراچی:شاہکار بک فاؤنڈیشن،۱۹۸۴ء۔
مستور، خدیجہ۔آنگن۔علی گڑھ:ایجوکیشن بک ہاؤس،۱۹۸۳ء۔
مستور، خدیجہ۔ زمین۔ادارہ فروغ لاہور،۱۹۸۴ء۔
منظر، حسن۔دھنی بخش کے بیٹے۔کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۸ء۔
منظر، حسن۔ العاصفہ ۔کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۰۶ء۔
منظر، حسن۔انسان، اے انسان۔کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء۔
منظر، حسن۔حبس۔کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء۔
منظر، حسن۔دو مختصر ناول۔کراچی:شہرزاد پبلشرز،۲۰۱۳ء۔
منظر، حسن۔انسانیت کا تابوت، مشمولہ ماہنامہ چہار سو، جلد ۱۹، راولپنڈی، شمارہ (مئی جون، ۲۰۱۰ء)۔
منیر احمد، شیخ۔تہذیبی رویے۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۷۴ء۔
نسیم، قائم رضا۔فاضل لکھنوی، مرتضیٰ (مرتبین)نسیم اللغات۔لاہور:غلام علی اینڈ سنز،۱۹۸۱ء۔

ویب سائٹ:

http://udb.gov.pk/result.php?search=%D8%AA%D8%B1%DA%A9+%D8%B3%DA%A9%D9%88%D9%86%D8%AA، تاریخ ملاحظہ:۱۲دسمبر ۲۰۲۱ء۔
https://www.merriam-webster.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۲دسمبر ۲۰۲۱ء۔

https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/displacement تاریخ
ملاحظہ:۱۳دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.vocabulary.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۵دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/english/displacemen
t?q=displacement تاریخ ملاحظہ:۱۶دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.lexico.com/definition/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۷دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.yourdictionary.com/displacement تاریخ ملاحظہ:۱۸دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.wordreference.com/definition/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۰دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.collinsdictionary.com/dictionary/english/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۲دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.ldoceonline.com/dictionary/displacement تاریخ ملاحظہ:۲۵دسمبر۲۰۲۱ء۔

https://www.verywellmind.com/identity-versus-confusion-2795735/ تاریخ ملاحظہ:۱۰

https://encyclopedia.ushmm.org/content/ur/article/introduction-to-the-
holocaust/ تاریخ ملاحظہ:۲۸فروری،۲۰۲۲ء۔

https://daanish.pk/49401/ تاریخ ملاحظہ:۲۸فروری،۲۰۲۲ء۔

اجمل کمال، حسن منظر کا العاصفہ و دیگر نیا ادب، ویب سائٹ BBC Urdu.com، وقت اشاعت بدھ، ۲۲اگست
۲۰۰۷ء، 19:53PST